۷۸۶

۱۳۳۵ھ

شعر العجم

(Part II)

حصّہ دوم

خواجہ فریدالدّین عطّارؒ سے حافظ اور ابن یمین تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف

تاریخ عجم

۱۳۲۴ھ

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف

تذکرہ

۱۳۲۵ھ

مصنّفہٗ

شبلی نعمانیؒ

باہتمام:۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی

در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع شد

۱۹۴۷ء

فہرست مضامین

شعرالعجم حصۂ دوم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
شاعری کا دوسرا دور اور اس کے خصوصیات	۱	تصانیف	۴۸
خصوصیات کے اسباب	۳	یورپ کی مختلف زبانون مین ان کے تراجم	۴۹
خواجہ فریدالدین عطار	۱ - ۱۴	شاعری	۵۳
نام وابتدائی حالات،	۷	آزادی	۵۵
خواجہ صاحب کی تصنیفات	۱۰	اظہار جذبات	۵۹
کلام پر رائے،	״	مرثیہ کی اصلاح	۶۰
کمال اسمٰعیل اصفہانی	۱۵ - ۲۵	اخلاقی شاعری	۶۱
ابتدائی حالات	۱۵	باریک نکتے	۶۳
کمال کی شاعری کی عظمت	۱۷	قوت تخییل،	۶۷
کمال کی خصوصیات	۱۸	طرز ادا	۶۹
رباعی	۲۴	غزل گوئی اور اس کی خصوصیات	۸۵
سعدی شیرازی	۲۶ - ۹۵	امیر خسرو دہلوی	۱۷۵،۹۶
بچپن کے حالات	۲۶	ولادت وتعلیم	۹۶
طالب العلمی،	۲۹	دربار کے تعلقات	۹۸
سیر وسیاحت	۳۰	وفات	۱۱۰
شیراز مین واپس آنا،	۳۸	آل واولاد واعزہ	״
دربار کے تعلقات	۳۹	فقر وتصوف	۱۱۴
وفات	۴۴	جامعیت اور کمالات	۱۱۸
عام حالات اور اخلاق وعادات	۴۵	سنسکرت دانی	۱۱۹

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
موسیقی میں کمال	۱۲۱	سن رشد و شاعری کی شہرت	۱۹۲
تصانیف	۱۲۳	وفات	۲۰۱
شاعری	۱۲۸	آل و اولاد،	۲۰۲
شاعری میں تلمذ	۱۲۹	حفظ قرآن،	۲۰۴
خود اپنی شاعری کی نسبت اظہار رائے،	۱۳۲	تجرد و آزادی	؍؍
خصوصیات شاعری،	۱۳۵	کلام پر رائے	۲۰۹
امیر خسرو کی مثنویاں،	۱۳۸	غزل	۲۱۱
قصائد،	۱۴۸	اساتذہ کا تتبع،	؍؍
غزل	۱۵۲	خواجہ صاحب کی خصوصیات	۲۱۹
واقعہ گوئی و معاملہ بندی	۱۵۸	جوش بیان	۲۲۰
روزمرہ اور عام بول چال	۱۶۰	بدیع الاسلوبی	۲۲۸
مسلسل غزلیں،	۱۶۴	واردات عشق	۲۳۵
جدت	۱۶۷	فلسفہ	۲۴۱
مضمون آفرینی،	۱۶۹	فلسفہ اخلاق	۲۴۵
غربت	۱۷۱	واعظین کی پردہ دری	۲۴۷
صنائع و بدائع	۱۷۲	علماء کے اخفائے حق پر ملامت	۲۵۱
سلمان ساوجی	۱۷۶-۱۸۹	روزمرہ و محاورہ	۲۵۲
خاندان اور مولد	۱۷۶	خوش نوائی	۲۵۷
درباری تعلقات	۱۷۷	بندش کی چستی،	۲۶۰
کلام پر رائے	۱۸۱	شوخی و ظرافت	۲۶۳
سلمان کی بدعات	۱۸۷	تسلسل مضامین	۲۶۵
غزل	۱۸۸	ابن یمین	۲۶۷-۲۷۰
خواجہ حافظ	۱۹۰-۲۶۶	نام و وطن	۲۶۷
نام و نسب اور بچپن،	۱۹۰	کلام	۲۶۸

شعر العجم

حصہ دوم

(ساتویں صدی ہجری تا ۹۰۰ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاعری بلکہ تمام اسلامی علوم و فنون کا جوش شباب تھا کہ دفعتہً تاتار کی طرف سے اس زور کا طوفان اٹھا کہ دنیا کا شیرازہ بکھر گیا، یعنی ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک بے چراغ کر دیا، کم و بیش چالیس لاکھ آدمی کا خون بہ گیا، سیکڑوں ہزاروں شہر خاک کے برابر ہو گئے، مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، علمی خزانوں کا ایک ایک ورق اُڑ گیا، لیکن اسلام کچھ ایسا سخت جان تھا کہ ان ہنگاموں پر بھی زندہ بچ گیا، بلکہ جوں ہی یہ طوفان تھمنا شروع ہوا، دبی ہوئی چنگاریاں پھر چمکیں اور چمک کر اس طرح مشتعل ہوئیں کہ ایک دفعہ پھر ع عالم تمام مطلع انوار ہو گیا،

چنگیز خاں ایک غارت گر کی شان سے اٹھا تھا، اور اپنے فوری اور سرسری انتظامات کے لئے اس نے کچھ قاعدے بھی بنا لئے تھے جو تو رہ چنگیز خانی کے نام سے مشہور ہیں، لیکن جب سلطنت کو استقلال ہوا تو شاہانہ نظم و نسق کی ضرورت پڑی، تاتاری لوٹ مار کے سوا

اور کچھ جانتے نہ تھے، اس لئے مسلمانوں سے اعانت لینے کے سوا چارہ نہ تھا، چنگیز خاں کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی قاآن اور اس کے بعد چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو بن تولی بن چنگیز خاں تخت نشین ہوا ہلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا، رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کر لیا یہاں تک کہ اس کا بیٹا تکودار، خواجہ شمس الدین محمد وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا اور اپنا نام احمد رکھا، ترک اس پر بگڑ گئے اور ارغوخاں (ہلاکو خاں کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خاں کو گرفتار کر کے ۶۸۳ھ میں قتل کر دیا، لیکن جب ارغوں خاں کا بیٹا غازان خاں ۶۹۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا، اور اس کے ساتھ ساٹھ ہزار ترک مسلمان ہو گئے، غازان ۷۰۳ھ میں مر گیا، اس کے بعد اس کا بھائی خدابندہ اور اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابوسعید بادشاہ ہوا، یہ تمام سلاطین نہایت عادل، انصاف پسند، مدبر اور دیندار تھے، اور بالخصوص سلطان ابوسعید کے عدل و انصاف اور نظم ونسق کے قواعد اور آئین، مساجد اور مدارس پر کندہ ہو کر مدتوں قائم رہے، یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے جو مشہور صوفی گذرے ہیں اپنی مثنوی جام جم میں ابوسعید کی اس طرح مدح سرائی کی ہے،

سکہ بر نام بوسعید زدند	دو جہاں را صلاے عید زدند
مدح ایں گلبن اُدلو الامری	در چمن گفتہ بلبل وقمری

سلطان ابوسعید نے ۷۳۶ھ میں وفات پائی، تمام ملک نے اس کے مرنے کا ماتم کیا، یہانتک کہ مسجد کے میناروں پر ماتمی کپڑے لپیٹے گئے اور ہر شہر کی گلی کوچوں میں کئی کئی دن تک خاک اڑتی رہی، چونکہ سلطان کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے ہر طرف سے سرداروں نے خودسری کی آذربائجان، امیر چوبان و شیخ حسن جلائر نے دبا لیا عراق اور فارس پر مظفر نے قبضہ کیا، غرض ۷۳۶ھ سے ۷۸۱ھ تک تمام قوتیں پریشان رہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے فرماں روا آپس میں

لڑتے بھڑتے رہے، یہی زمانہ ہے جو تاریخ میں طوائف الملوکی کے نام سے مشہور ہے[۱]،
بالآخر تیمور اٹھا اور تمام دعویداروں کو مٹا کر شہنشاہی قائم کی، اس کے خاندان میں
حکومت کا جو سلسلہ قائم ہوا، اس کا خاتمہ سلاطینِ صفویہ کے آغاز سے جا کر ملتا ہے جہاں سے
ہماری کتاب کا تیسرا حصہ شروع ہوتا ہے،

مذکورۂ بالا واقعات میں ہمارے کام کی جو باتیں ہیں حسب ذیل ہیں:-

۱- تاتار کے قتل عام میں جو بے شمار جانیں ضائع ہوئیں، اس نے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کو فنا کر دیا، اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئیں شاعری کے فرائض پورے کرنے کے لئے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں مثلاً

ہمای ہمایوں خواجوی کرمانی، آئینہ اسکندری امیر خسرو، سکندر نامۂ جامی، تیمور نامۂ ہاتفی، شاہنامۂ قاسم گونابادی، اکبر نامہ فیضی، لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے منھ چڑھاتے ہیں، دل میں کچھ نہیں، قوم اس قدر افسردہ ہو گئی تھی کہ ان کتابوں کے دو شعر بھی زبانوں پر مہ نہ رہ سکے،

۲- عام قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا زیادہ یاد آتا ہے، اس لئے اس عہد میں تصوف کا زیادہ زور ہوا، عطار، مولٰنا روم، اوحدی، عراقی، سعدی، مغربی، انہی اسباب کے نتائج ہیں،

۳- جنگی جذبات کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا جو تصوف کے سوا ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا یعنی غزل گوئی، یہ مسلّم ہے کہ غزل جس چیز کا نام ہے اُس کی ابتدا شیخ سعدی اور اُن کے معاصرین سے ہوئی، یہ اسی کا اثر ہے،

---

[۱] یہ تمام حالات اوّل سے آخر تک مجالس المومنین اور دولت شاہی سے لئے گئے ہیں،

تاتار اور تیمور کی عام سفاکی نے قوموں کی قومیں غارت کر دین، بڑے بڑے کج کلاہوں اور اورنگ نشینوں کا تاج و تخت خاک میں ملا دیا، خراسان سے لے کر شام تک زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا، ام الدنیا بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، تمام بڑے بڑے پایۂ تختوں میں خاک اڑنے لگی، کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ آدمی ایک دم سے فنا ہو گئے، ان امور نے دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا تھا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا، اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے، شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ کے ہاں ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے، ان لوگوں نے یہ سمان خود آنکھوں سے دیکھا تھا، وہی زبان پر آیا، اور پھر ایک روش قائم ہو گئی، اور سب اسی انداز میں کہنے لگے،

۴- ترک اور مغل بادشاہ اگرچہ اکثر نہایت مدبر اور عادل تھے اور اس لئے ان کے عہد میں عام امن و امان رہا، لیکن طبیعتوں میں شاعری کا مذاق نہ تھا، اس لئے دربار میں شعرا کی چنداں قدر نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے جو مشہور شعرا ہیں، مثلاً سعدی، خواجہ حافظ مولانا روم، اوحدی، ابن یمین کسی دربار سے خاص تعلق نہ رکھتے تھے، نہ سلطنت سے انکو کوئی خطاب حاصل تھا،

۵- اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں فی الجملہ آزادی کی روح آئی، سعدی اور ابن یمین کے قصائد اور قطعات میں جو خوشامدانہ و بیہودہ گوئی کی جا بجا عیب گیری پائی جاتی ہے وہ اسی کا اثر ہے،

۶- تیموریہ خاندان جو ایران میں قائم ہوا اُس کا خاتمہ سلطان حسین مرزا پر ہوا، وہ عادل اور ہنر پرور ہونے کے ساتھ شعر و شاعری کا نہایت فریفتہ اور قدردان تھا، اس لئے اس کے عہد میں شاعری اس کثرت سے پھیلی کہ بچہ بچہ شاعر بن گیا والہ داغستانی، ریاض الشعرا

یں لکھتے ہیں،

دررعایت فضلاء وشعرا سعی بلیغ فرمودہ است ودر تربیت شعرا آں قدر مبالغہ کردہ است کہ فن شاعری کہ فضیلت علوم را لازمہ داشت از علم جدا شد وہر بے مایہ بہ محض طبیعت موزوں، ارادہ شاعری کرد رفتہ رفتہ فن شاعری کہ الطف فنون بود از درجۂ اعتبار افتادہ بہ مضحکہ انجامید،

سلطان حسین کا انجام، صفویہ کے آغاز سے ملا ہوا ہے، اس لئے صفویہ کے زمانہ میں دفعۃً جو ایران کے چپہ چپہ سے شعرا ابل پڑے، یہ وہی سلطان حسین کے ابر فیض کے رشحات تھے، والہ داغستانی کو تو یہ رنج ہے کہ اس تعمیم کی وجہ سے ہر عامی شعر کہنے لگا اور علمی کمالات کی قید اٹھ گئی، لیکن ہمارے نزدیک، اسی بات نے شاعری کو شاعری کے رتبہ پر پہنچایا، بے شبہہ پہلے شعرا کے لئے علوم عربیہ اور معقول و منقول سے واقف ہونا ضرور ہوتا تھا، لیکن ان کمالات کے بوجھ میں اصلی جذبات دب کر رہ جاتے ہیں، اور وقار و متانت عوام کے معتقد علیہ ہونے کی وجہ سے اکثر جذبات اس آزادی سے ظاہر نہیں ہوتے تھے جس طرح دل میں آتے تھے، یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین کی عشقیہ شاعری، اس قدر اصلی جذبات سے لبریز ہے کہ قدماء کے ہاں اس کا پتہ بھی نہیں لگ سکتا،

اس دور میں شاعری میں اصناف ذیل کو ترقی ہوئی،

تصوف، عطار، مولانا روم، اوحدی، عراقی، مغربی،

غزل، مولانا روم، شیخ سعدی، امیر خسرو، حسن، خواجہ حافظ،

اخلاق و موعظت، شیخ سعدی، ابن یمین،

قصیدہ گوئی، کمال اسمٰعیل، سلمان ساوجی،

قصیدہ گوئی میں، جو ترقی ہوئی، اُس کی تفصیل حسبِ ذیل ہی،

(۱) زبان زیادہ صاف ہوگئی، قدمار کے دور میں ظہیر فاریابی نے زبان کو جس حد تک صاف کردیا تھا، وہ اس دور کی اخیر سرحد ہے، کمال اسمٰعیل نے اور بھی زیادہ صاف کیا،

(۲) مضمون آفرینی میں بہت ترقی ہوئی کمال نے ابتدا کی اور سلمان نے اس حد تک پہنچا دیا کہ متاخرین کی سرحد سے ڈانڈا مل گیا،

(۳) خاقانی و انوری وغیرہ جو علمی اصطلاحات سے کلام کو زیر بار کرتے تھے، یہ بات جاتی رہی، اس عہد کے قصائد ایک عامی کو بھی دیدئے جائیں تو اصطلاحات وغیرہ کی بنا پر اس کو کہیں اٹکاؤ نہ ہوگا،

اب ہم اس دور کے مشہور شعرا، کا حال لکھتے ہیں،

اس موقع پر اس قدر لکھدینا ضرور ہے کہ اس دور کے ایک بڑے رکن شاعری یعنی مولنا روم کا تذکرہ ہم کو قلم انداز کرنا پڑا ہے جس کی وجہ یہ ہے، کہ ہم ان کے حالات اور ان کی شاعری پر ایک مستقل کتاب "سوانح مولنا روم" کے نام سے لکھ چکے ہیں، اور وہ گھر گھر پھیل چکی ہے،

در بکر بستنِ مضمون رنگیں لطف نیست کم وہد زنگ ار کسی بند دحنای بستہ را

خواجہ فریدالدّین عطّار

(ولادت شعبان ۵۱۳ھ، وفات ۶۲۷ھ)

اصلی نام محمد تھا، فریدالدّین لقب ہے، نیشاپور کے اضلاع میں کدگن ایک گاؤں ہے، وہاں کے رہنے والے تھے، ان کے والد ابراہیم بن اسحاق، عطاری کا پیشہ کرتے تھے، اور کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا، باپ کے مرنے کے بعد اُنھوں نے کارخانہ کو اور زیادہ رونق دی، ریاض العارفین میں لکھا ہے کہ نیشاپور کے تمام کارخانے خواجہ صاحب کے اہتمام میں تھے، ارباب تذکرہ متفقاً لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب ایک دن دکان میں بیٹھے ہوئے تھے، کسی طرف سے ایک فقیر آنکلا، اور اُن کی دکان کے ساز و سامان اور آرایش کو دیر تک غور سے دیکھا کیا، خواجہ صاحب نے ناراض ہوکر کہا کیوں بے فائدہ اوقات ضائع کرتے ہو اپنا راستہ لو، اس نے کہا تم اپنی فکر کرو، میرا جانا کیا مشکل ہے، میں یہ چلا، یہ کہہ کر وہیں لیٹ گیا، خواجہ صاحب نے اٹھکر دیکھا تو تمام ہو چکا تھا، سخت متاثر ہوئے، کھڑے کھڑے دکان لٹوا دی اور سارا کاروبار چھوڑ کر فقیر ہو گئے،

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے خود خواجہ صاحب کی تصنیفات نہیں پڑھیں، ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تصوف اور فقر کے کوچہ میں آنے کے بعد بھی وہ اپنے قدیم پیشہ میں مشغول رہے اور اسی حالت میں اسرار اور عرفان کے حقائق پر کتابیں لکھتے رہے، مصیبت نامہ اور الٰہی نامہ جو ان کی قابل قدر تصنیفیں ہیں، اسی زمانہ

کی تصنیف ہیں، چنانچہ خود لکھتے ہیں،

مصیبت نامہ کاندوہ جہان است | الٰہی نامہ کاسرار عیان است
بہ دار و خانہ ہر دو کرد م آغاز | چہ گویم، زود رستم زین و آں باز

خواجہ صاحب کی تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عطار نہیں بلکہ طبیب بھی تھے، اور بڑے زور شور کا مطب تھا، روزانہ پانسو آدمی ان کے مطب میں آتے تھے، خسرو نامہ میں لکھتے ہیں،

بہ دار و خانہ پانصد شخص بودند | کہ در ہر روز نبضم می نمودند
میان آں ہمہ گفت و شنیدم | سخن را بہ از ایں روے ندیدم

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں،

بمن گفت اے بمعنی عالم افروز | چنیں مشغول طب گشتی شب و روز
سہ سال است ایں زماں تا لب بہ بستی | بہ زہد خشک در کنجے نشستی

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب بچپن سے درد آشنا تھے، ان کے والد قطب الدین حیدر[1] کے مرید تھے، جو مشہور مجذوب گذرے ہیں، اور ۵۹۷ھ تک زندہ تھے، جب کہ خواجہ صاحب کی عمر ۴۸ برس کی تھی، خواجہ صاحب نے بچپن ہی میں ان سے فیض حاصل کیا تھا، لیکن چونکہ اسلام رہبانیت کو گوارا نہیں کرتا اور اسی وجہ سے حضرات صوفیہ کو ان کے مجاہدات اور ریاضتیں مشاغل دنیوی سے مانع نہیں آئیں، اس لئے خواجہ صاحب نے باوجود فقر اور تصوف کے عطار خانہ اور مطب کا تعلق قائم رکھا، اور متعدد کتابیں اسی حالت میں تصنیف کیں، یہ ممکن ہے کہ اخیر میں جب جذبۂ محبت زیادہ بڑھا تو خود بخود ادھر چیزوں سے دل

[1] دولت شاہ،

اچاٹ ہوگیا، اسی حالت میں فقیر کا واقعہ گذرا، اور اس نے آگ پر روغن کا کام دیا، خواجہ صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم میں اُنھوں نے مدت تک سیاحی بھی کی، لسان الغیب میں لکھتے ہیں،

چار اقلیم جہاں گردیدہ ام . . . .
سر برآوردہ بہ مجوے عشق سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق
کوفہ و رے تا خراساں گشتہ ام سیحن و جیحونش را بریدہ ام
ملک ہندوستان و ترکستان زمیں رفتہ چوں اہل خطا از سوے چیں
عاقبت کردم بہ نیشاپور جاے اوفتادہ از من بعالم ایں صداے
در نشاپورم بہ کنج خلوتے با خداے خویش کم دم و صدتے

خواجہ صاحب نے اگرچہ بہت سے بزرگوں سے فیض اٹھایا تھا، لیکن جیسا کہ دولت شاہ نے لکھا ہے، خرقۂ فقر مجد الدین بغدادی سے حاصل کیا تھا،

مجد الدین بغدادی، قطب الدین خوارزم شاہ کے طبیب[1] خاص تھے، جس زمانہ میں چنگیز خاں دنیا کے مرقع کو زیر و زبر کر رہا تھا، خواجہ صاحب نیشاپور میں تھے، نیشاپور کی غارت گری میں ایک مغل نے خواجہ صاحب کو پکڑ کر قتل کر دینا چاہا، برابر سے ایک مغل بولا کہ ہزار روپیے پر میرے ہاتھ بیچڈالو، خواجہ صاحب نے مغل سے کہا کہ اتنی قیمت پر کبھی نہ بیچنا میرے دام بہت زیادہ ہیں، ایک اور مغل آنکلا، اس نے کہا اس غلام کو میرے ہات ایک توبڑہ گھانس کے معاوضہ میں فروخت کر دو، خواجہ صاحب نے گرفتار کرنیوالے سے کہا ضرور بیچڈالو، میری قیمت اس سے کہیں کم ہے، خواجہ صاحب کی اس اختلاف بیانی

---

[1] ریاض العارفین،

کو وہ تمسخر سمجھا، اور ان کو قتل کر ڈالا، وہ اس نکتہ کو کیا سمجھ سکتا تھا کہ واقعی انسان سے بڑھکر کوئی چیز گراں نہیں، اور نہ اس سے بڑھکر کوئی چیز ارزاں ہی، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین ہ

مغل نے خواجہ صاحب کو قتل کر دیا، لیکن خواجہ صاحب کا خون خالی نہیں جا سکتا تھا، مغل کو ان کی عظمت کا حال معلوم ہوا تو توبہ کر کے ان کے مزار کا مجاور ہو گیا، اور مرتے دم تک جدا نہ ہوا[۱]،

خواجہ صاحب کی تصنیفات

تصنیفات کی تفصیل یہ ہے، اسرار نامہ، الٰہی نامہ، مصیبت نامہ، جوہر الذات، وصیت نامہ، منطق الطیر، بلبل نامہ، حیدر نامہ، گل و ہرمز، سیاہ نامہ، شتر نامہ، مختار نامہ، ان کے علاوہ غزلوں اور رباعیوں کا دیوان ہے، کل اشعار ایک لاکھ سے زیادہ ہیں، فقرار کا ایک تذکرہ لکھا ہے جو تذکرۃ الاولیار کے نام سے مشہور ہے اور حال میں مسٹر براؤن نے اس کو شائع کیا ہے، عبدالوہاب قزوینی نے جو مسٹر براؤن کے شاگرد ہیں، ایک محققانہ دیباچہ لکھا ہے،

کلام پر رائے

صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں، سنائی، اوحدی، مولانا روم، اور خواجہ فریدالدین عطار، خود مولینا روم باوجود ہمہ تنگی کے فرماتے ہیں، ع

ما از پس سنائی و عطار آمدیم

ہفت شہر عشق را عطار گشت — ماہماں اندر خم یک کوچہ ایم

خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کئے ہیں وہ حکیم سنائی سے زیادہ دقیق نہیں، لیکن زبان اس قدر صاف ہے کہ اس وصف کا گویا، ان پر خاتمہ ہو گیا، ہر قسم

---

[۱] ریاض العارفین،

کے خیالات اس بے تکلفی، روانی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف ادا نہیں ہو سکتے،

اس کے ساتھ قوت تخیل بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، بہت سے نئے مضامین پیدا کئے ہیں، اور جو پہلے بندھ چکے تھے، ان کو ایسے نئے پہلو سے ادا کرتے ہیں کہ بالکل نیا مضمون معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ مضمون کہ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد، سقراط، فارابی، بوعلی سینا، الگ الگ طریقہ سے ادا کر چکے ہیں، تاہم خواجہ صاحب نے اس کی بالکل صورت بدل دی، فرماتے ہیں،

کامے گفتہ است می باید بسے   عقل و حکمت تا شود گویا کسے
باز باید عقل بے حد و قیاس   تا شود خاموش یک حکمت شناس

یعنی ایک کامل کا قول ہے کہ بولنے اور تقریر کرنے کے لئے بہت عقل اور حکمت درکار ہے لیکن چپ رہنے کے لئے اس سے بھی کہیں زیادہ عقل درکار ہے مطلب یہ ہے کہ جب انسان انتہائے درجۂ کمال تک پہنچتا ہے، تب جا کر یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں سمجھا، اور اس بنا پر چپ ہو جاتا ہے، اسی خیال کو ایک رباعی میں ادا کیا ہے،

می پنداری کہ جاں توانی دیدن   اسرار ہمہ جہاں توانی دیدن
ہرگاہ کہ بینش تو گردد بکمال   کور تی خود آں زماں توانی دیدن

وحدت وجود کا مضمون حد سے زیادہ پامال ہو چکا تھا، تاہم خواجہ صاحب کے پیرائے نئے ہیں،

پرشما ز دوست ہر دو کون لیک   سوئی او زہرہ اشارت نیست

فغانی نے اسی مضمون کو اڑایا ہے،

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست | اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند
خواجہ صاحب کے اور مختلف طرز ادا دیکھو،
از برائے غریب خود خود گشت | جلوہ در قد و در قدم رفتار
تاب در زلف، و وسمہ بر ابرو | سرمہ در چشم، و غازہ بر رخسار
رنگ در آب و آب در یاقوت | بوی در مشک، و مشک در تاتار
قم باذنی و قم باذن اللہ | ہر دو یک نغمہ آمد از لب یار
تو از دریا جدائی دیں عجب بیں | ز تو یک لحظہ ایں دریا جدا نیست
در عشق چو من تو ام تو من باش | یک پیرہن ست گو دو تا باش
خواجہ صاحب کا جو فلسفہ ہے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوگا،
عبادت اور وحی کی حقیقت،
روزہ حفظ دل ست از خطرات | پس بود با مشاہدہ افطار
حج چہ باشد ز خود سفر کردن | بہ کجا؟ جانب بدایت کار
وحی چہ بود ہر انچہ در دل تو | سر زند از نتائج اسرار
انسان اصل حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا،
قرب سی سال بود تا کہ ہمی کندم جان | کہ بجاں راہ برم راہ نہ بردم بہ تنم
گرچہ بسیار ہی سن بازی فکرت کردہ ام | بیش ازیں چیزے نمی دانم کہ سرگردان ترم
وصل تو گنجے است ہم پنہاں ز خود | ہر کہ گوید یافتم دیوانہ ایست
بیگانہ شدم ز ہر دو عالم | واگہ نہ کہ آشنای من کیست
چندیں در بستہ بے کلید است چہ سود | کس نام کشادن نشنید است چہ سود

پیراہن یوسف ست یک یک ذرات | یوسف زمیانہ ناپدیداست چہ سود
نقش تو درخیال خیال از تو بے بصر | نام تو بر زبان و زباں از تو بے خبر
درحقیقت گر قدم خواہی زدن | محو گردی تا کہ دم خواہی زدن
ہر آں مے کہ بشناسد سر از پا | از و دعوی امستی ناپسند است
اگر در عشق از عشقت خبر نیست | ترا ایں عشق عشق سودمند است
عشق بتاں و خویشتن بفروش | کہ نکوتر ازیں تجارت نیست
دریں دریا کہ من ہستم نہ من ہستم نہ دریا ہم | نداند ہیچ کس ایں سر مگر آں کو چنیں باشد
ترا در راہ یک یکدم چو معراجیست سوئے حق | زیک یک پایہ برتر می گزر چندانکہ بتوانی
گرفتم در بہشت نسیہ نتوانی رسیدن تو | وے خود را ازیں دوزخ کہ نقدست برہانی

اخیر شعر میں ان لوگوں کے خیال کو رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بہشت کوئی چیز نہیں سکو
اُدھار سمجھنا چاہیئے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ مانا کہ بہشت ادھار ہے لیکن یہ تو کرنا
چاہیئے کہ اس نقد دوزخ (تفکرات دنیوی) سے نجات ہات آوے،

تو چوں در بند صد چیزے خدارا بندہ چوں گردی | کہ تو در بند ہر چیزے کہ ہستی بندۂ آنی

عالم حقیقت، کفر و اسلام دونوں سے بالاتر ہے،

لب دریا ہمہ کفرست و دریا جملہ دینداری | ولیکن گوہر دریا ورائے کفر و دیں باشد

انسان ہی میں سب کچھ ہے،

انچہ می جوئید بیرون دو عالم سالکان | خویش را یابند چوں ایں پردہ از ہم بردرند
بہ ہمیں دیدہ بنگری ظاہر | صورت خویش را بصورت یار
ہر کہ ایں جا ندیدہ محروم ست | در قیامت ز لذت دیدار

انا لیلےٰ بگو اگر مردے　　ورنہ چوں ابلہاں سری می خوار

وحدت وجود

جہاں از تو پُر و تو در جہاں نہ　　ہمہ در تو گم و تو درمیاں نہ

خموشی تو از گویائی تست　　نہانی تو از پیدائی تست

ترا با ذرّہ ذرّہ راہ بینم　　دو عالم تم وجہ اللہ بینم

دوئی را نیست رہ در حضرت تو　　ہمہ عالم توئی و قدرت تو

نکو گوئے نکو گفتہ است در ذات　　کہ التوحید اسقاط الاضافات

خدارا جز خدا یک دوست کس نیست　　کہ در خود و خدا ہم اوست کس نیست

درین معنی کہ من گفتم شکے نیست　　تو بے حیثی و عالم جز یکے نیست

کمال اسمٰعیل خلّاق المعانی اصفہانی

(وفات ۶۳۶ سنہ ہجری)

اسمٰعیل نام، اور کمال تخلص تھا، ان کے والد جمال الدّین عبدالرزاق مشہور شاعر تھے، ان کا پورا دیوان آج موجود ہے، آتش کدہ میں ان کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں، ان کے دو بیٹے تھے، عبدالکریم اور اسمٰعیل، عبدالکریم فقیہ تھے، اسمٰعیل نے بھی مذہبی علوم حاصل کئے تھے لیکن شاعری کا مذاق خاندانی تھا، اس لئے اسی طرف توجہ کی اور اسی میں کمال پیدا کیا، خاندان صاعدیہ[1] کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، جلال الدّین خوارزم شاہ کی مدح میں بھی قصیدہ کہا ہے، جو دیوان میں موجود ہے، لیکن درباروں میں چنداں قدر نہیں ہوئی،

ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ آپ خاندان صاعدیہ کی مدح کرتے ہیں اور سلاطین سے اعراض کرتے ہیں، بولے کہ صاعدیہ سخن فہم ہیں، اُن سے دادِ سخن ملتی ہے، اور میں اس کو صلہ سے بڑھ کر سمجھتا ہوں[2] تاہم چار و ناچار، سلاطین کی مدح بھی کرتے تھے، بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ جب سلطان سنجر سلجوقی، گرجستان کو فتح کر کے اصفہان میں آیا تو کمال نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے،

---

[1] یہ کوئی شاہی خاندان نہ تھا بلکہ اصفہان کے قضاۃ میں سے تھے،

[2] بہارستان سخن از شاہ نواز خاں مصنف مآثر الامراء

حجابِ ظلم تو برداشتی ز چہرۂ عدل | نقابِ کفر تو بکشادی از رخِ ایمان

بالآخر افسردہ ہو کر ترک تعلقات کیا، اور حضرت شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کی، دیوان میں ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں موجود ہے، ایک دفعہ کسی بات پر اہل وطن سے ناراض ہوئے، اور نظم میں بددعا کی،

اے خداوند ہفت سیارہ | بادشاہے فرست خونخوارہ
تا دروکوہ را چو دشت کند | جوئے خوں آورد نہ جو بارہ
عددِ مردماں بیفزاید | ہر یکے را کند بہ صد پارہ

۶۳۵ھ میں جب اوکتائی قاآن، اصفہان میں پہنچا تو قتل عام کا حکم دیا، اس زمانہ میں یہ گوشہ نشین ہو چکے تھے، اور شہر کے باہر ایک زاویہ میں رہتے تھے، چونکہ لوگ ان کا ادب کرتے تھے، اور ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا، اس لئے اکثر لوگ نقدی وغیرہ ان کے گھر میں لاکر امانت کے طور پر رکھدیتے تھے، گھر میں ایک کنواں تھا، وہ ان امانتوں کا خزانہ بن گیا تھا، شہر کی غارت گری میں ایک ترک اس طرف نکل آیا، اور ایک پرند کو غلیل سے مارنا چاہا، اتفاق سے زہ گیر اڑ کر کنوئیں میں جا پڑی، ترک کنوئیں میں اترا، زر و جواہر کا انبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، سمجھا کہ اور بھی خزانے گڑے ہوں گے، کمال اسمٰعیل کو پکڑا کہ پتہ بتاؤ، انھوں نے لاعلمی ظاہر کی، اس نے غصہ میں آکر ان کا خاتمہ کردیا، مرتے وقت یہ رباعی کہی اور اپنے خون سے دیوار پر لکھی،

دل خوں شد و شرطِ جانگدازی این است | در حضرتِ تو کمینہ بازی این است
با این ہمہ ہیچ دم نمے باید زد | شاید کہ ترا بندہ نوازی این است

ا؎ اصفہان کے ایک محلہ کا نام ہے ۲؎ یہ تمام حالات آتشکدہ اور دولت شاہ سے ماخوذ ہیں،

ریاض الشعرا میں ایک اور رباعی لکھی ہے، جو کمال نے اس حالت میں لکھی تھی وہ یہ ہے

این کشتۂ تیغ، کمال اسمٰعیل است — قربان شدنش نہ از رہ تجمیل است
قربان تو شد کمال اندر رہ عشق — قربان شدن از کمال اسمٰعیل است

ید بیضا میں لکھا ہے کہ ترک کی انگوٹھی گر گئی تھی، اس کے نکالنے کے لئے وہ کنوئیں میں اترا تھا، ید بیضا میں اس واقعہ کا سن ۶۲۶ھ لکھا ہے،

شاعری — کمال کی شاعری، قدما اور متاخرین کی مشترک سرحد ہے یعنی اس کا ایک سرا قدما اور دوسرا متاخرین سے ملا ہوا ہے، قدما کی متانت، پختگی، استواری اور متاخرین کی مضمون بندی، خیال آفرینی، نزاکت مضمون، دونوں یکجا جمع ہو گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین دونوں ان کے معترف ہیں، خواجہ حافظ فرماتے ہیں،

گر باورت نمی شود از بندہ این حدیث — از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم
گر بر کنم دل از تو و بردارم از تو مہر — آں مہر بر کہ افگنم و دل کجا برم

عرفی کہتا ہے،

مرا ز نسبت ہمدردی کمال غم است — وگرنہ شعر چہ غم دارد از غلط خوانی

حزیں کے زمانہ میں بحث پیدا ہوئی کہ کمال اور جمال میں سے کس کو ترجیح ہے، لوگوں نے حزیں سے استفتا کیا، اس نے یہ جواب لکھا،

در شعر جمال ارچہ جمالے بکمال است — امانہ بہ زیبائی افکار کمال است
لفظش بہ صفا آئینۂ شاہد معنی است — یعنی بہ نکوئے ست کہ طغرائی ہلال است
صد بار ز سر تا سر دیوانش گزشتم — لیلی ست کہ سر تا بقدم غنج و دلال است
دریوزہ گر رشحۂ او بند حریفاں — الحق رگ ابر قلمش بحر نوال است

کمال اور محقق طوسی ہمعصر ہیں، کمال کی بلند پائگی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو گی کہ محقق طوسی نے عظمت کے لہجہ میں کمال کا ذکر اپنی کتاب معیار الاشعار میں کیا ہے،

کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

۱۔ بہت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے جن سے متاخرین کی مضمون آفرینیوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے مثلاً

چوں صبح باز کرد دہن را بوصف او　　　چرخش درست مغربی (اشرفی) اندر دہاں نہاد

جب صبح نے بادشاہ کی تعریف میں منہ کھولا تو آسمان نے اس کے صلے میں اسکے منہ میں اشرفی ڈالدی

افگند چار نعل ہلال، آسماں دو بار　　　تا بارکاب خواجہ عناں بر عناں نہاد

بیروں فگند چرم تر از دو زباں ز کام　　　از بسکہ بار جود بر او بیکراں نہاد

۲۔ نہایت مشکل طرحیں کرتے ہیں، اور ان میں نئے نئے مضمون پیدا کرتے ہیں، مثلاً

در گرد عزم او نہ رسد برق گرم رو　　　ور زآتشش بود بہ مثل چوں شرار پاے

از یمن ہمت تو بر آرم چو مور پر　　　از فرط عجز، اگرچہ ندارم چو مار پاے

ترسم کہ چوں دراز شد ایں شعر ہیچکس　　　در گوش خویش جا نہ دہد چوں ہزار پاے (کنکھجورا)

ایک بڑا سیر حاصل قصیدہ لکھا ہے، جس کی ردیف برف ہے،

ہرگز کسے ندید بدینساں نشان برف　　　گوئی کہ لقمہ ایست زمیں در دہان برف

مانند پنبہ دانہ کہ در پنبہ تعبیہ (پوشیدہ) است　　　اجرام کوہ گشتہ نہاں در میان برف

۳۔ زبان کی صفائی اور سلاست کی حد جو ظہیر فاریابی پر ختم ہو چکی تھی کمال نے اس سرحد کو اور آگے بڑھایا، مثلاً

سپیدہ دم کہ نسیم بہار مے آید   نگاہ کردم و دیدم کہ یار مے آید

شراب در سر، و چہرہ ز شرم رنگ آمیز   چنیں میانۂ شرم و وقار مے آید

رخش چو شاخِ درخت بہشت ہر گل زا   کہ می بچیدم، دگر ببار مے آید

اس کا چہرہ، بہشت کا درخت تھا کہ جو پھول میں چنتا تھا، اس کی جگہ دوسرا نکل آتا تھا

زبسکہ داشت دل خستہ بستہ در فتراک   چناں نمود مرا کز شکار مے آید

گرفتمش ہمہ رہ در حدیث و او گہ گہ   بقدر حاجت، پاسخ گزار مے آید

میں نے اسے باتوں میں لگایا اور وہ بھی کبھی کبھی بقدر ضرورت جواب دیتا جاتا تھا،

ہر آں فریب کہ از عشوہ بست در کارم   مرا ز سادہ دلی، استوار مے آید

مرا غرور کہ تشریف می دہد او خود   برائے خدمت صدر کبار مے آید

ایک قصیدہ میں ممدوح کی لیت ولعل کرنے کی شکایت ہے، ردیف ہیچ ہے اور کس روانی سے ہر جگہ ادا ہوتی ہے،

صدرا روا مدار کہ ز انعام خود مرا   محروم ماندہ داری و آں را بہانہ ہیچ

ہر روز بامداد کنم رو بہ درگہت   یک دل پر از امید و پس آنگہ شبانہ ہیچ

چندیں ہزار تیر معانی و شست طبع   کردم کشادہ و ماند از و بر نشانہ ہیچ

پنجاہ سال خدمت ایں خانہ کردہ ام   وامروز نیست بہرہ من جز فسانہ ہیچ

گر مستحق ہیچ نیم من، بدیں ہنر   پس نیست مستحق عطا، در زمانہ ہیچ

از طالعست آنکہ من آفتاب چرخ   مشہور عالمیم و بر آں آستانہ ہیچ

زانم نمیدہی کہ ترا در خزانہ نیست   یعنی کریم را نبود در خزانہ ہیچ

بر منہج امید من، از وعدہ ہائے تو   دامے است بس نگر دراں دام دانہ ہیچ

آگے اور عنوانوں کے نیچے جو اشعار آئیں گے، ان میں صفائی زبان کی خصوصیت پر بھی لحاظ رکھنا چاہئے،

۴۔ شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہے کہ شاعری کی ایک صنف یعنی ہجو اور ظرافت جو انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے پچوں کی زبان بن گئی تھی، کمال نے اسکو نہایت لطیف اور پرمزہ کر دیا، اگرچہ بہتر تو یہی تھا کہ یہ بیہودہ صنف سرے سے اڑا دی جاتی، لیکن ہجو شعرا کا ایک بڑا آلہ تھا، جس سے اُن کے معاش کو تعلق تھا، اس لئے وہ اس سے بالکل دست بردار نہیں ہو سکتے تھے، امرا اور سلاطین، جب صلہ کے دینے میں لیت و لعل کرتے تھے تو کمال ہجو اور ظرافت سے کام لیتا تھا لیکن اس طرح کہ خود اُس شخص کو مزہ آئے جس کی ہجو لکھی گئی ہے، ایک دفعہ گھوڑے کے زین و لگام اور دانہ گھاس کے لئے ممدوح سے درخواست کی، دیکھو کس ظریفانہ پیرائے میں اس مطلب کو ادا کیا ہے،

دوش خربندہ کرد پیشم یاد — کاینک خواجہ زندگی بتو داد

(سائیس) تنگ دل گشتم اندرہ خبرش — کہ جواں بود و زیرک و استاد

گرچہ غمگین شدم ز واقعہ اش — گفتم الحق از آں یکے دل شاد

کہ شنیدم کہ او بہ وقت وفات — بہ وصیت لب و دہاں بکشاد

از جو و کاہ و از جل و افسار — ہرچہ بُد، در وجوہ خیر نہاد (یعنی خیرات کیا)

(گھاس) (زین) (لگام) در جہاں وقت ایں چنیں توفیق — بہمہ جانور خدا بدہاد

واجبم گشت تعزیت نامہ — بتو اے سرور کریم نہاد

بر تو فرض است حق گذاری او — زانکہ در خدمتت بسے استاد

مستحق تر ز اسپ من نبود | گر وصیت ہمی کنی انفاذ (جاری کرنا)
ہیچ تاخیر بر نتابد خیر | زود تعجیل کن کہ خیرت باد

یعنی کل سائیس نے مجھ سے یہ خبر بیان کی کہ حضور کا گھوڑا مر گیا، مجھکو سخت رنج ہوا لیکن اس خیال سے خوشی بھی ہوئی کہ اس نے مرتے وقت وصیت کی اور جو کچھ اس کے پاس ساز و سامان تھا، سب خیرات کر دیا، ایسی توفیق خدا سب کو دے بہر حال آپ پر اس کا بڑا حق ہے، اور آپ کو اس کی وصیت پوری کرنی چاہئے لیکن اس وصیت کا مستحق، میرے گھوڑے سے بڑھ کر کوئی نہیں،

ایک بخیل کی ہجو کی ہے،

دی مرا گفت دوستے کہ مرا | با فلاں خواجہ از پے دو سہ کار
سخنے (کل) چند ہست و از پے آں | خلوتے مے بباید م ناچار
خلوتے آں چناں کہ اندر وے | ہیچ مخلوق را نباشد بار (گذر)
گفتم ایں فرصت ار توانی یافت | وقت ناں خوردنش نگہ مے دار (خیال رکھو)

یعنی مجھ سے کل ایک دوست نے کہا کہ فلاں رئیس سے مجھ کو کچھ مخفی کام ہے، اس لیے میں ایسی تنہائی کا موقع چاہتا ہوں، کہ اس وقت ان کے پاس کوئی نہ ہو میں نے کہا ایسا موقع صرف اُن کے کھانے کے وقت مل سکتا ہے،

ایک اور بخیل کی ہجو میں لکھتے ہیں،

ز مرد فانی باور کنم اگر گوید | کہ من بخانہ خود می خورم طعام حلال
نہ آنکہ مال حلالست، مرد فانی را | کدام مال کہ او دارد و کدام حلال
دے ز ممسکی آنگاہ مال خویش خورد | کز اضطرار مرا او را شود حرام حلال

یعنی فلاں شخص اگر کہے کہ میں اکل حلال کھاتا ہوں تو میں یقین کر لوں گا، لیکن نہ اس بنا پر کہ درحقیقت اس کا مال پاک اور حلال ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ کھانا اتنی دیر کے بعد کھاتا ہے، جبکہ مردار بھی حلال ہو جاتا ہے، (کم سے کم تین دن کے بعد)

ایک اور بخیل کی ہجو،

بدہن نان خواجہ چوں بردم ۔ خواجہ گفتا کہ آہ من مردم
گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر ۔ کہ من ایں لقمہ را فرو بردم

کسی نے کمال کو برا کہا تھا، اس کے جواب میں کہتے ہیں،

شخصے بد ما بہ خلق مے گفت ۔ ما از بد او نمے خراشیم
(برا نہیں مانتے)
ما نیکی او بخلق گفتیم ۔ تا ہر دو، دروغ گفتہ باشیم

محقق طوسی کا یہ مشہور قطعہ

نظام بے نظام ار کافرم خواند ۔ چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلمان خوانمش زیرا کہ نبود ۔ سزاوار دروغے جز دروغے

اسی قطعہ سے ماخوذ ہے،

ایک رئیس سے صلہ کا تقاضا کیا ہے اور کس قدر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے،

سہ شعر[1] رسم بود، شاعران طامع را ۔ یکے مدیح، دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ورندا وہجا ۔ ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگرچہ فرمائی

یعنی شعراء پہلے مدح کہتے ہیں، پھر صلہ کی یاد دہانی کے لئے ایک نظم لکھتے ہیں، اب اگر ممدوح نے صلہ عنایت کیا تو شکریہ لکھتے ہیں، ورنہ ہجو، میں ان تینوں نظموں سے

---

[1] یہ اشعار انوری کی طرف بھی منسوب ہیں،

دو لکھ چکا ہوں، تیسری کی نسبت کیا ارشاد ہوتا ہے،

غزل کی نسبت یہ مسلّم ہے کہ سب سے پہلا خاکہ کمال ہی نے قائم کیا ہے، جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے، خان آرزو مجمع النفائس میں نغانی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں،

قدما را در غزل طرزے بود بسیار سادہ، چوں نوبت بہ کمال الدین اسمٰعیل رسید، او رنگے دیگر داد، بعد از و شیخ سعدی و خواجو نمک دیگر ریختند،

کمال نے غزل میں سادگی اور صفائی کیساتھ رنگینی اور جدتِ مضمون بھی پیدا کی، جس کا اندازہ ان مثالوں سے ہوگا،

دوش بگذشتم و دشنام ہمیداد مرا خدمتش کردم و پنداشت کہ من نشنیدم

کل میں ادھر سے گذرا تو وہ مجھکو گالیاں دے رہا تھا، میں نے اسکو سلام کیا، اور وہ سمجھا میں نے گالیاں نہیں سنیں،

گرچہ لعلش بہ سرِ ناخوشی آنہا میگفت من از آں خوشتر از و ہیچ سخن نشنیدم

اس کے ہونٹھ اگرچہ بری طرح گالیاں دے رہے تھے لیکن میں نے اس سے زیادہ خوش مزہ کوئی بات آج تک نہیں سنی

زمستان است اندازی ندارد چشم کس ہرگز مگر چشمش کہ چوں شد مست ناوک بہتر اندازد

مست آدمی اچھی طرح تیراندازی نہیں کرسکتا، لیکن اسکی آنکھیں مستی میں اور زیادہ ٹھیک نشانہ لگاتی ہیں،

جہاں انداز دمن تیرے، کنم در سینہ پنہانش بداں تا از پئے ہر تیر تیرے دیگر اندازد

از چشم نیم خواب تو امروز روشن است آں نالہ ہا کہ در غم تو دوش کردہ ایم

بود ہمیشہ جان من رسم تو بے گنہ کشتی ہیچ نمی کشی مرا من چہ گناہ کردہ ام

زبان کی سادگی دیکھو،

روئے زاں خوبتر تواند بود؟ ہاں بگوئید اگر تواند بود

آنچناں نازک وچناں شیریں
لب بناشد شکر تواند بود

دل خود طلب چو کردم بر نرگس تو گفتا
بروائے فلاں وبہماں بر من چہ کار دارد
جو بسے بگفتم او را بکرشمہ گفت بامن
سر گفتگو ندارم، کہ مرا خمار دارد (مجھے خمار ہے)
چہ دہی صداع مستاں چہ کنی حدیث چیزے (تکلیف)
کہ کمینہ ہندوے من بہ ازیں ہزار دارد (غلام)

نخستم دل بدام اندر کشیدی
پس آنگاہم، قلم بر سر کشیدی
بقصد جاں چو من ناتوانے
زروم و ہند و چیں لشکر کشیدی
پراگندہ ہمہ غمہائے عالم
زبہر من، بہ یک دیگر کشیدی
اگرچہ آستیں بر من فشاندی
دگر چہ دامن ازمن در کشیدی
نہ خواہد رفت از یادم کہ بامن ق
شبے تا صبحدم ساغر کشیدی

رباعی

رباعی کو جس قدر کمال نے ترقی دی، قدما اور متوسطین میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی،

گل خواست کہ چوں رخش نکو باشد و نیست
چوں دلبر من برنگ و بو باشد و نیست
صد روے فراہم آورد در سالے
باشد کہ یکے چو روے او باشد و نیست (شاید)

گر لاف زنم کہ یار خوشخوست نہ
با ما بہ وفا و عہد نیکوست، نہ
زیں نادرہ تر کہ از برائے تو مرا
شہرے ہمہ دشمن اند و تو دوست نہ

در دیدۂ من نگار من بایستے
یا با غم او صبر بہم بایستے

یا مایۂ غم چو عمر کم بایستے　　یا عمر بہ اندازۂ غم بایستے

یار آمد دوش کردمش مہمانے　　ہرچش گفتم نہ کرد، نافرمانے
مے خورد و بخفت مست در بستم　　وانگاہ بہ او چہ کردہ باشم دانے

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی

مصلح[1] الدین لقب اور سعدی تخلص تھا ان کے والد اتابک سعد بن زنگی بادشاہ شیراز کے ملازم تھے، اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا[2]،

سال ولادت معلوم نہیں، وفات کی نسبت سب متفق ہیں کہ ۶۹۱ھ میں ہوئی، عمر کی مدت عام تذکروں میں ۱۰۲ برس کی لکھی ہے لیکن اس حساب سے سال ولادت ۵۸۹ھ ہوگا، شیخ نے تصریح کی ہے کہ وہ ابو الفرج ابن جوزی کے شاگرد ہیں، اور غالباً یہ وہ زمانہ ہوگا، جب شیخ بغداد میں تحصیل علم کے لئے آئے ہیں، ابن جوزی نے ۵۹۷ھ میں وفات پائی، شیخ کی ولادت اگر ۵۸۹ھ میں مانی جائے تو ابن جوزی کی وفات تک ان کی عمر کل ۹ برس کی ہوگی، اور یہ کسی طرح صحیح نہیں، بعض تذکروں میں شیخ کی عمر ۱۲۰ برس لکھی ہے، اگر یہ خارج از قیاس عمر مان لی جائے تو اور واقعات کی کڑیاں مل جائیں گی لیکن ایک سخت دقت پھر بھی باقی رہتی ہے، وہ یہ کہ شیخ نے گلستاں میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں سلطان محمود خوارزم شاہ نے خطا سے صلح کی میں کاشغر میں آیا"

سلطان محمود ۵۸۹ھ میں مرا ہے، اس لئے اس زمانہ میں ان کی عمر ۱۸ برس کی ہوگی، لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی شاعری اور کمالات نے کم از

[1] مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا، اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔ [2] تذکرۂ دولت شاہی،

۳۰-۴۰ برس کی عمر میں شہرت پائی ہے، اس لئے یا تو شیخ نے غلطی سے علاءالدین تکش خوارزم شاہ کے بجائے محمود خوارزم شاہ کا نام لکھدیا ہے، یا اُن کی شاعری کی شہرت ان کے شباب ہی میں ہو چکی ہو گی،

شیخ کے بچپن کے حالات اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے قلمبند نہیں کئے، لیکن خود شیخ کے بیانات سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں،

شیخ کے والد نے شیخ کو جب پڑھنے کے لئے بٹھایا تو لکھنے کی تختی، کاغذ اور ایک طلائی انگوٹھی خرید کر دی، یہ اس وقت اس قدر کمسن تھے، کہ کسی نے مٹھائی دیکر ان سے انگوٹھی اڑالی، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

زعہد پدر یاد دارم بسے — کہ باران رحمت برو ہر دمے
کہ در طفلیم لوح و دفتر خرید — زبہرم یکے خاتم زر خرید
بدر کرد ناگہ یکے مشتری — بشیرینی از دستم انگشتری

شیخ کے والد شیخ کو مزید محبت اور تربیت کے خیال سے ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے، ایک دفعہ عیدگاہ میں ان کو ساتھ لے کر چلے، ہات میں دامن پکڑا دیا تھا کہ ساتھ سے الگ نہ ہو جائیں، راستہ میں بچے کھیل رہے تھے، یہ دامن چھوڑ کر ان میں جا ملے اور باپ کا ساتھ چھوٹ گیا، کشمکش اور ہجوم میں باپ کی صورت نظر نہ آئی تو گھبرا کر رونے لگے اتفاق سے باپ نے دیکھ لیا، کان پکڑ کر کہا احمق! تجھ سے کہا نہ تھا کہ دامن نہ چھوڑنا، اس قسم کے واقعات ہر بچہ کو پیش آتے ہیں، لیکن اس سے یہ پاکیزہ نتیجہ نکالنا کہ

توہم طفل راہی بہ سعی ای فقیر — برو دامن پیر دانا بگیر

شیخ کا کام ہے،

ان کے باپ ان کی تربیت اس طرح کرتے تھے جس طرح ایک عارف سالک مرید کو تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کرتا ہے، وہ بات بات پر ان کو ٹوکتے تھے، اور ان کی غلطیوں پر تنبیہ کرتے تھے، ان کے اثر سے شیخ کو بچپن ہی میں زہد و عبادت کا چسکا پڑ گیا تھا، ایک دفعہ حسب معمول باپ کی صحبت میں رات بھر جاگے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے، گھر کے اور آدمی غافل سو رہے تھے، ان کو خیال آیا، باپ سے کہا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے بے خبر سو رہے ہیں کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اُٹھ کر دو رکعت نماز پڑھ لے، باپ نے کہا جانِ پدر! اگر تم بھی سو رہتے تو اس سے بہتر تھا کہ لوگوں کی غیبت کر رہے ہو،

بچپن میں جب ان کو وضو کرنا نہیں آتا تھا، محلہ کے ایک مولوی صاحب سے روزہ اور نماز سیکھنی شروع کی، مولوی صاحب نے وضو کے سب آداب و سنن سکھا کر یہ بھی بتایا کہ روزہ میں دوپہر ڈھلنے کے بعد مسواک کرنا منع ہے، پھر کہا کہ ان فرائض کو مجھ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں جانتا ہوگا، گاؤں کا رئیس بالکل بڈھا پھوس ہو گیا ہے، رئیس نے سنا تو کہلا بھیجا کہ

نہ مسواک در روزہ گفتی خطا است | بنی آدم مردہ خوردن روا است

یعنی تم نے خود بتایا کہ روزہ میں مسواک کرنا منع ہے، لیکن کیا مردہ کا گوشت کھانا (غیبت کرنا) جائز ہے،

شیخ کے باپ نے ان کے بچپن ہی میں وفات پائی، اور جس ناز و نعم سے پل رہے تھے وہ سامان جاتے رہے، خود کہتے ہیں،

من آنگہ سرِ تاجور داشتم | کہ سر در کنار پدر داشتم

اگر بر وجود م نشستے مگس — پریشاں شدے خاطر چند کس

کنوں دشمناں گر برندم اسیر — نباشد کس از دوستانم نصیر

مرا باشد از درد طفلاں خبر — کہ در طفلی از سر برفتم پدر

لیکن ان کی والدہ ان کی جوانی تک زندہ رہیں اور ان سے بھی ان کو اخلاقی سبق ملتے رہتے تھے، گلستاں میں لکھا ہے،

وقتے از جہل جوانی بانگ بر مادر زدم، دل آزردہ بہ کنجے نشست و گریاں ہمی گفت مگر خوردی رافراموش کردی کہ درشتی می کنی (باب ششم)

طالب علمی

شیراز میں اگرچہ تحصیل علم کا ہر قسم کا سامان مہیا تھا سیکڑوں علما و فضلا درس و تدریس میں مشغول تھے، اس کے علاوہ آتابک منظفر الدین تکلہ بن زنگی المتوفی ۵۹۱ھ کا مدرسہ موجود تھا، لیکن اس زمانہ میں تحصیل کمال کے لئے ممالکِ دور و دراز کا سفر اور مشہور درسگاہوں میں حاضر ہونا لازمی امر خیال کیا جاتا تھا، اس زمانہ میں سب سے بڑا مدرسہ جس کو یونیورسٹی کہہ سکتے ہیں، نظامیۂ بغداد تھا، شیخ نے نظامیہ میں تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ عام طریقہ تھا، مدرسہ سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہوگیا، یہ پتہ نہیں چلتا کہ نظامیہ میں انھوں نے کس سے تحصیل علم کی، ان قرائن سے کہ شیخ نے ابن جوزی کی شاگردی کی، ابن جوزی بغداد میں رہتے تھے، شیخ نظامیہ میں حدیث پڑھتے تھے، لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ نے نظامیہ میں ابن جوزی ہی کے آگے زانوے شاگردی تہ کیا، لیکن مدرسین نظامیہ کی فہرست میں ہم ابن جوزی کا نام نہیں پاتے، بے شبہ ابن جوزی بغداد میں حدیث کا درس دیتے تھے لیکن اپنے مکان پر دیتے ہوں گے، نظامیہ سے ان کا

۱؎ جامع التواریخ صفحہ ۳،

تعلق ثابت نہیں ہوتا،

یہ عجیب بات ہے کہ ابن جوزی کا اثر شیخ کی تعلیم پر نہیں پڑا، ابن جوزی ان محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں جو حدیث اور روایت میں نہایت سخت احتیاط سے کام لیتے تھے اور مشتبہ اور ضعیف روایتوں کو بالکل ترک کر دیتے تھے، لیکن شیخ اتفاق سے کہیں کوئی حدیث ذکر کرتے ہیں تو عموماً ضعیف بلکہ مصنوعی ہوتی ہے، مثلاً

سزد گر بدورش بنازم چناں　　　　که سید به دوران نوشیرواں

یا مثلاً لی مع اللہ وقت لا یسعہ ملک مقرب الخ

یا مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث زرنی غبا الخ

یا مثلاً طبیب فارس کی حدیث وغیرہ وغیرہ،

شیخ کی تحصیل علمی کا زمانہ ہے، جب اتابکان فارس کے سلسلہ میں سے سعد زنگی تخت حکومت پر متمکن تھا، وہ نہایت عادل اور صاحب جبروت حکمران تھا، لیکن معلوم نہیں کیا اسباب تھے کہ شیخ کو شیراز میں امن و آسایش سے رہنا نہیں نصیب ہو سکتا تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں،

سعدیا حب وطن گرچہ حدیثے است صحیح　　　　نتواں مرد بہ سختی کہ من آنجا زادم

غرض شیخ نے تحصیل علم سے فارغ ہوکر، سیر و سیاحت شروع کی اور ایک مدت دراز تک سفر کرتے رہے جس کی مدت عام تذکرہ نویس ۲۰ برس لکھتے ہیں،

سیر و سیاحت کی غرض مختلف ہوتی ہے اور جو غرض پیش نظر ہوتی ہے، سیاح اسی حیثیت سے تمام چیزوں کو دیکھتا ہے، بلکہ تمام چیزیں اسی حیثیت سے خود اس کی نظر میں جلوہ گر ہوتی ہیں، شیخ میں کثرت سے مختلف حیثیتیں جمع تھیں، وہ

شاعر تھے، صوفی تھے، فقیہ تھے، واعظ تھے، حسن پرست تھے، رند تھے، شوخ طبع تھے، اس لئے اُنھوں نے تماشاگاہِ عالم کو ہر ہر پہلو سے دیکھا،

وہ کبھی زہد و ریاضت کے عالم میں حج و زیارت کے لئے بڑے بڑے سفر کرتے ہیں، نہایت دشوار گذار اور چٹیل صحراؤں میں پیادہ پا سیکڑوں کوس چلے جاتے ہیں، رات رات بھر کی متصل پیادہ روی سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور عین راستہ میں پتھریلی زمین پر پڑ کر سو جاتے ہیں، کبھی نفس کشی کے لئے بیت المقدس میں کاندھے پر مشک رکھ کر سقائی کرتے ہیں، لوگوں کو پانی پلاتے پھرتے ہیں، کبھی صاحبِ دل درویش کا تذکرہ سن کر اس کی زیارت کے لئے روم پہنچتے ہیں، کبھی انبیاؑ کے مزارات پر اعتکاف کرتے ہیں، جمعہ کا دن ہے، نماز کو جانا چاہتے ہیں، لیکن پاؤں میں جوتی نہیں، دل میں شکایت پیدا ہوتی ہے، دفعۃً ایک شخص پر نظر پڑتی ہے، جس کے سرے سے پاؤں ہی نہیں، صبر آجاتا ہے، اور سمجھ جاتے ہیں کہ صبر و رضا کی تعلیم ہے،

ایک دفعہ لوگوں کی صحبت سے تنگ آکر بیت المقدس کے صحرا میں بادیہ نوردی شروع کی، اتفاق سے عیسائیوں نے پکڑ لیا اور طرابلس (ٹرپولی) میں خندق کھودنے کے کام پر لگایا، بہت پریشان ہوئے، لیکن مجبور تھے، اتفاق سے ایک قدیم دوست کا ادھر گذر ہوا، پوچھا خیر ہے؟ فرمایا،

همی گریختم از مردماں بکوہ و بہ دشت — کہ از خدائے نبودم بہ دیگرے پرداخت
قیاس کن کہ چہ حالت بود دریں ساعت — کہ با طویلۂ نامردم بباید ساخت

یعنی جو شخص آدمیوں سے بھاگتا پھرتا تھا، جب جانوروں میں پھنس جائے تو اس کی کیا حالت ہوگی، دوست کو رحم آیا، فدیہ دے کر ان کو چھڑایا، اور اپنے ساتھ

حلب میں لائے مزید عنایت سے سو اشرفی مہر پر اپنی بیٹی کیساتھ شادی کردی، لیکن صاحبزادی نہایت شوخ اور زباں دراز تھیں، شیخ سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی، ایک دن کہنے لگیں تم اپنی ہستی بھول گئے، تم وہی تو ہو کہ میرے باپ نے دس دینار دیکر تم کو چھڑایا، شیخ نے کہا ہاں دس دینار دیکر چھڑایا، لیکن سو دینار کے عوض پھر گرفتار کرادیا،

شیخ نے تصوف وسلوک کی تعلیم شیخ شہاب الدین سہروردی المتوفی سنہ ۶۳۰ھ سے حاصل کی، اسی سیاحت کی بدولت سفر دینا میں ان کا ساتھ ہوا، اور ان کے فیض صحبت سے شیخ نے تزکیۂ نفس کے مراتب طے کئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

مرا پیر دانائے فرخ شہاب — دو اندرز فرمود بر روے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش — دگر آنکہ بر غیر بدبیں مباش

ایک دفعہ بعلبک کی جامع مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے اور نحن اقرب الیہ من جبل الورید کا نکتہ بیان فرمارہے تھے، کسی پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا، تاہم یہ اپنے عالم میں مست تھے اور یہ شعر زبان پر تھا،

دوست نزدیک تر از من بہ من است — ویں عجب تر کہ من از وے دورم
چہ کنم با کہ تواں گفت کہ او — در کنار من و من مہجورم

اتفاق سے کوئی صاحب دل آنکلے، اُنھوں نے بیساختہ نعرہ مارا، ان کے اثر سے مجلس گرما گئی، شیخ کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ، "دوران با بصر نزدیک و نزدیکان بے بصر دور"، ایک دفعہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے قاضی کے دربار میں گئے، اور اونچی صف میں جاکر بیٹھے، قاضی صاحب نے تیز نگاہوں سے دیکھا اور میر دربار نے جو لوگوں کو حسب مدارج بٹھانے پر مامور تھا، ان کے پاس آکر کہا،

ندانی کہ برتر مقام تو نیست　　　فروتر نشیں یا برو یا بایست

بیچارے وہاں سے اٹھ کر صف پائیں میں آکر بیٹھے، تھوڑی دیر کے بعد حسب معمول کسی فقہی مسئلہ پر بحث چھڑی اور ہر طرف سے شور وغل کی آوازیں بلند ہوئیں، لیکن کوئی شخص کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہتا تھا کہ سب اس کے سامنے سر جھکا دیں، شیخ کو اظہار کمال کا موقع ملا، صف پائیں سے للکار کر کہا،

کہ برہان قوی باید و معنوی　　　نہ رگہائے گردن بہ حجت قوی

لوگوں نے ان کی طرف توجہ کی، اُنھوں نے اس خوبی سے اس مسئلہ کو سلجھا کر ادا کیا کہ سب مان گئے، یہاں تک کہ خود قاضی صاحب صدر مجلس سے اٹھے اور اپنی پگڑی اتار کر ان کے سر پر رکھدی،

اُس زمانہ میں اتنا انصاف بھی تھا، آج کا دن ہوتا تو کوئی اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا،

اسکندریہ کے مشہور قحط میں جس میں لوگ بھوک کے مارے آدمی کو زندہ بھون کر کھا جاتے تھے، ایک دولتمند مخنث نے اپنا خوان کرم اس قدر وسیع کر رکھا تھا کہ کسی شخص کے لئے روک نہ تھی، شیخ اس زمانہ میں اسکندریہ ہی میں تھے، ان کے دوستوں نے ان سے کہا کہ مخنث کی دعوت میں چلنا چاہئے، ان کی خودداری نے گوارا نہ کیا، اور کہا

نہ خورد شیر، نیم خوردہٗ سگ　　　ورز سختی بمیرد اندر غار

شیخ کی آزادروی اور تجرد کے لحاظ سے بظاہر قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اہل عیال کا جھگڑا نہیں خریدا ہوگا، لیکن تاریخی شہادتیں موجود ہیں، کہ اُنھوں نے اس تجربہ گاہ کی بھی سیر کی، ایک دفعہ تو وہی مجبوری کا تعلق اختیار کرنا پڑا تھا، جس کا ذکر اوپر گذر چکا، دوسری دفعہ

صنعا، (یمن کا صدر مقام)، میں نکاح کا اتفاق ہوا، اور اس سے اولاد ہوئی، لیکن بچپن ہی میں جاتی رہی، باوجود آزادی کے شیخ کو اس کا بہت صدمہ ہوا چنانچہ خود بوستان میں فرماتے ہیں،

بہ صنعا درم طفلے اندر گذشت ‏ ‏ ‏ ‏ چہ گویم کزانم چہ برسر گذشت

یہاں تک کہ حواس باختہ ہوئے کہ قبر کا ایک تختہ اکھاڑ کر لخت جگر کو دیکھنا چاہا، لیکن ہولناک منظر دیکھ کر کانپ اٹھے اور غشی سی طاری ہو گئی، ہوش میں آئے تو فرزند دلبند نے زبانِ حال سے کہا،

شبِ گور خواہی منور چو روز ‏ ‏ ‏ ‏ ازینجا چراغِ عمل بر فروز

جس زمانہ میں سلطان خوارزم شاہ نے خطا والوں سے صلح کر لی، شیخ کاشغر میں آئے جامع مسجد میں ایک مدرسہ تھا جس میں حسب دستور درسیات کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، سیر کرتے کرتے مدرسہ میں آئے، ایک خوش جمال لڑکا زمخشری کی کتاب (غالباً مفصل ہو گی) پڑھ رہا تھا اور یہ فقرہ زبان پر تھا ضرب زید عمرا، شیخ نے کہا خوارزم و خطا میں صلح ہو گئی اور زید اور عمر کا جھگڑا اب تک ختم نہیں ہو چکا، لڑکا ہنس پڑا اور اُن کا نام و نشان پوچھا، اُنھوں نے کہا شیراز، شیخ کا شہرہ عالمگیر ہو چکا تھا، شیراز کا نام سُن کر اس نے کہا سعدی کے شعر بھی کچھ آپ کو یاد ہیں؟ اُنھوں نے عربی کے دو شعر اسی وقت موزون کر کے پڑھے، لڑکا سمجھ نہ سکا، بولا کہ ہمارے ملک میں تو اُن کے فارسی شعر مشہور ہیں، آپ فارسی شعر پڑھتے تو میں سمجھ بھی سکتا، شیخ نے برجستہ کہا،

ای دلِ عشاق بدامِ تو صید ‏ ‏ ‏ ‏ ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

دوسرے دن کسی نے لڑکے سے کہدیا کہ یہی سعدی ہیں، وہ دوڑا ہوا شیخ کے پاس گیا،

اور نہایت اخلاص و عقیدت ظاہر کی، اور کہا کہ آپ نے نام کیوں نہیں ظاہر فرمایا، کہ میں خدمت گذاری کی سعادت حاصل کرسکتا، شیخ نے جواب دیا ع

باوجودت زمن آواز نیاید کہ منم — تیرے سامنے میں یہ کہہ نہ سکا کہ میں ہوں

لڑکے نے عرض کی کہ چند روز آپ کا قیام ہوتا تو سب آپ سے مستفید ہوتے، شیخ نے کہا نہیں میں نہیں ٹھہر سکتا، پھر یہ اشعار پڑھے،

بزرگے دیدم اندر کوہسارے — قناعت کردہ از دنیا بہ غارے

بدو گفتم بہ شہر اندر نیائی — کہ بارے بندے از دل برکشائی

بگفت آنجا پری رویان نغزند — چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

وقت کی تہذیب دیکھو، شیخ جیسا مقدس اور صوفی منش ایک امرد کو گلے لگاتا ہے، پیار کرتا ہے، منہ چومتا ہے اور پھر دیدہ دلیری سے کہتا ہے،

ایں بگفتیم و بوسۂ چند بر سر و روی یک دیگر دادیم و وداع کردیم،

بوسہ دادن بر روی یار چہ سود — ہم دراں لحظہ کردنش پدرود

اسی عالم سیاحت میں شیخ ہندوستان میں بھی آئے، عام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ امیر خسرو سے ملے تھے، لیکن مستند تاریخوں میں اسی قدر ہے کہ امیر خسرو کے ممدوح خان شہید[1] نے دو دفعہ شیخ کو شیراز سے طلب کیا، لیکن شیخ نے بڑھاپے اور ضعف کا عذر کیا، اور گلستاں و بوستاں اپنے ہاتھ سے لکھ کر تحفہ میں بھیجی،

خان شہید نے امیر خسرو کا کلام بھی بھیجا تھا، شیخ نے اس کی بہت تحسین کی اور لکھا کہ یہ جوہر قابل قدردانی کے قابل ہے،

[1] خان شہید نے ۶۸۲ھ میں شہادت پائی اور شیخ سعدی کے بلانے کا واقعہ اسی سنہ کے دو چار برس قبل کا واقعہ ہے

ہندوستان کے سفر کا ایک واقعہ شیخ نے **بوستان** میں لکھا ہے لیکن بیان واقعات میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ مشتبہ ہو جاتا ہے، ان کا بیان ہے کہ وہ سومنات میں آئے، یہاں ایک عظیم الشان بت خانہ تھا، پوجاریوں سے راہ ورسم پیدا کی، ایک دن ایک برہمن سے کہا کہ مجھکو سخت تعجب ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں، وہ نہایت برہم ہوا اور تمام بت خانہ میں یہ چرچا پھیل گیا، سب ان پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، انھوں نے کہا بت کے ظاہری حسن وخوبی کا میں بھی معترف ہوں، لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے، برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے، میں نے بھی بہت سفر کئے، اور ہزاروں بت دیکھے، لیکن جو معجزہ اس میں ہے کسی میں نہیں، یہ ہر روز صبح کو دعا کے لئے خود ہاتھ اٹھاتا ہے، چنانچہ دوسرے دن شیخ نے یہ شعبدہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا شیخ کو نہایت حیرت ہوئی اور اس فکر میں ہوئے کہ اصل راز کیا ہے، تقیۃً بت کے ہاتھ چومے اور بہت خشوع وخضوع ظاہر کیا اور بت خانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پوجاری مندر میں رہا کرتے ہیں، برہمنوں کو جب ان کی طرف سے اطمینان ہو گیا، تو ایک دن بت خانہ کا پھاٹک بند کر کے چاروں طرف نظر دوڑائی، دیکھا تو بت کی پشت کی طرف ایک مغرق پردہ ہے، پردہ کی اوٹ میں ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جس کے ہاتھ میں ایک رسی ہے، رسی میں بت کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اندر سے یہ شخص رسی کو کھینچتا ہے، تو ہاتھ اٹھ جاتے ہیں، ان کو دیکھکر وہ شخص بھاگا، انھوں نے تعاقب کر کے اس کو کوئیں میں ڈھکیل دیا، اور خود بھاگ نکلے،

ان واقعات کے بیان میں عام غلطیاں تو یہ ہیں کہ بت کو ہاتھی دانت کا بتایا ہے، حالانکہ ہاتھی دانت کو ہندو پاک نہیں سمجھتے، اس لئے اس کا بت نہیں بنا سکتے، برہمنوں کو

لکھا ہے کہ وہ پاژند پڑھتے تھے،

فتادند گبرانِ پاژند خواں　　　　چو سگ با من از بہر آں استخواں

حالانکہ پاژند ہندوؤں کی کتاب نہیں بلکہ پارسیوں کا صحیفہ ہے،

برہمنوں کو کہیں گبر اور کہیں مطران کہتے ہیں،

پس پردہ مطرانِ آذر پرست

حالانکہ مطران عیسائیوں کے پادری کو کہتے ہیں، پھر مطران کو آذر پرست کہنا اور بھی لغویت ہے، ان جزئیات کے سوا اصلی واقعہ بھی نہایت دور از قیاس ہے، شیخ کتنی ہی بت پرستی کرتے، لیکن یہ ناممکن تھا کہ ایک ایسے عظیم الشان بتخانہ میں تمام برہمن اور پجاری اکیلے ان کے ہاتھ میں بت خانہ چھوڑ کر باہر نکل جاتے اور ان کو یہ موقع ملتا کہ چاروں طرف کے دروازے بند کر کے جو چاہتے کرتے،

حقیقت یہ ہے کہ یہ تازہ ولایت تھے، خدا جانے کس چیز کو کیا سمجھے اور کس واقعہ کو کیونکر لکھ گئے، اکثر انگریز سیاحوں کا یہی حال ہے، دو چار دن ہندوستان میں رہکر سفرنامے لکھتے ہیں، جن کو پڑھ کر ہندوستانیوں کو غور کرنا پڑتا ہے، کہ یہ کس ملک کی داستان ہے

شیخ نے اس حکایت کے خاتمہ میں لکھا ہے، کہ سومنات سے میں ہندوستان میں آیا، غالباً اس زمانہ میں ہندوستان خاص دہلی اور نواح دہلی کو کہتے ہونگے لیکن شیخ نے کچھ زیادہ تصریح نہیں کی اور نہ کہیں سے پتہ لگتا ہے کہ کہاں تک پہنچے تھے،

شیخ نے جب سیاحت شروع کی تو فارس میں اتابکان سلغری کی حکومت تھی، یہ سلسلہ بھی اور سلسلوں کی طرح سلجوقیوں کا دست پرور تھا، اس سلسلہ کا پانچواں حکمران سعد زنگی شیخ سعدی کا ہمعصر تھا، لیکن اس کے اخیر زمانہ تک سعدی وطن میں نہیں آئے

صاف نہیں کھلتا کہ اس کے اسباب کیا تھے لیکن شیخ کی بعض تلمیحات سے معلوم ہوتا ہی کہ شیخ کو اس زمانہ میں امن و امان کی طرف سے اطمینان نہ تھا، سعد زنگی نے ۶۲۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا اتابک ابوبکر بن سعد زنگی تخت نشین ہوا، وہ نہایت شان و شوکت کا بادشاہ تھا، فارس کی حکومت جو دوسو برس سے تاراج گاہ بن رہی تھی اس کے زمانہ میں عروسِ رعنا بن گئی، ہر طرف نظم و نسق قائم ہو گیا، جا بجا مدرسے اور درس گاہیں کھل گئیں، علمار و فضلا و شعرا دور دور سے کھنچ آئے، شیخ ہمیشہ وطن کے شوق میں بیتاب رہتے تھے اور وطن پہنچنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے، چنانچہ ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں،

چہ خوش سپیدہ دمے باشد آنکہ بنیم باز	رسیدہ بر سر اللہ اکبر[1] شیراز
نہ لائق ظلمات ست باللہ ایں اقلیم	کہ تختگاہ سلیمان بدست و حضرت راز

اب جو امن و امان کی طرف سے اطمینان ہوا تو شام سے عراق و عجم ہو کر شیراز میں آئے، چنانچہ ایک قطعہ میں غریب الوطنی اور مراجعت کی وجہ تصریح لکھی ہی،

ایک قطعہ میں اس سے بھی زیادہ صاف لکھا ہی،

ندانی کہ من در اقالیم غربت	چرا روزگارے بکردم درنگی
بروں رفتم از تنگ ترکاں کہ دیدم	جہاں درہم افتاد چوں موے زنگی
ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن	چو گرگاں بخو نخوارگی تیز چنگی
چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم	پلنگان رہا کردہ خوے پلنگی
چناں بود در عہد اول کہ دیدم	جہاں پُر ز آشوب تشویش و تنگی

[1] اللہ اکبر، شیراز کے ایک چشمہ کا نام ہے،

چنیں شد در ایام سلطانِ عادل — اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

شیراز پہونچ کر شاہی تعلقات سے بالکل آزاد رہنا تو ممکن نہ تھا، ابوبکر بن سعد زنگی کے درباریوں میں داخل ہوئے، مدحیہ قصائد لکھے، گلستان اور بوستان اسی کے نام سے معنون کی، غالباً صلے بھی (بلا طلب) ملے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آزاد مزاجی کی وجہ سے دربار کے قابل نہ تھے اور ابوبکر بن سعد نے اس وجہ سے ان کی چنداں قدر دانی نہیں کی، چنانچہ ایک قصیدہ میں ہلکی سی شکایت بھی کی ہے،

بہ دولتت ہمہ افتادگاں بلند شدند — چو آفتاب کہ بر آسماں برد شبنم

مگر کمینۂ آحاد بندگان سعدی — کہ سعیش از ہمہ بیش است و حظش از ہمہ کم

انکیانو جو اباقاآن خاں (پسر ہلاکو خاں) کی طرف سے خاندانِ اتابک کے انقراض کے بعد شیراز کا گورنر مقرر ہوا تھا، اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں،

سعدیا چنداں کہ میدانی بگو — حق نباید گفتن الا آشکار

ہر کرا خوف و طمع در کار نیست — از خطا باکش نباشد وز تتار

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایشیائی درباروں میں کیونکر فروغ پا سکتے تھے، غرض ابوبکر بن سعد نے تو ان کے رتبہ کے موافق ان کا احترام نہ کیا، لیکن جو امراء خود صاحب علم و فضل تھے وہ شیخ کی پرستش کرتے تھے،

اس زمانہ میں علم و فضل کے اصلی پشت و پناہ شمس الدّین صاحب دیوان اور علاء الدّین تھے،

خواجہ شمس الدّین، ہلاکو خاں کا وزیر اعظم تھا، اور ہلاکو خاں کے زمانہ میں باوجود

اختلاف مذہب اور تاتاریوں کی سفاکی کے اسلام کا جو نام و نشان رہ گیا، وہ صرف خواجہ شمس الدین کا صدقہ تھا، تاتاریوں میں جو اسلام پھیلا وہ بھی خواجہ شمس الدین ہی کی بدولت تھا، سب سے پہلے اس سلسلہ میں نکودار (ہلاکو خاں کا بیٹا) اسلام لایا اور سلطان احمد کے لقب سے ملقب ہوا، نکودار نے خواجہ شمس الدین ہی کی ہدایت اور ترغیب کی وجہ سے اسلام قبول کیا تھا،

خواجہ شمس الدین کا دوسرا بھائی علاء الدین ہلاکو خاں کی طرف سے بغداد کا حاکم تھا اور نہایت صاحب فضل وکمال تھا تاتاریوں کی سب سے مفصل اور مستند تاریخ جہانکشا اسی کی تصنیف ہے، یہ دونوں بھائی شیخ سعدی کے مرید اور معتقد خاص تھے، شیخ ایک دفعہ جب حج سے واپس آکر تبریز میں آئے جو ہلاکو خاں کا پایہ تخت تھا تو خواجہ شمس الدین سے ملنے گئے، اتفاق یہ کہ ادھر سے اباقاآن خان (پسر ہلاکو خاں) کی سواری آرہی تھی، خواجہ شمس الدین اور علاء الدین بھی ساتھ تھے، شیخ نے اس خیال سے کہ تعارف کا یہ موقع نہیں، چاہا کہ نظر بچاکر نکل جائیں، اتفاق سے دونوں بھائیوں نے ان کو دیکھ لیا، گھوڑوں سے اتر پڑے اور جاکر شیخ کے ہاتھ پاؤں چومے، اباقاآن خاں دیکھ رہا تھا، اس کو سخت حیرت ہوئی کہ برسوں سے یہ میرے دربار میں ہیں اور نمک خوار ہیں تاہم جو تعظیم انھوں نے اس بوڑھے کی کی، میری بھی کبھی نہیں کی، جب دونوں بھائی شیخ سے رخصت ہوکر جلوس میں شامل ہوئے تو اباقاآن نے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا؟ جس کی تم نے اس قدر تعظیم وتکریم کی، انھوں نے کہا، یہ ہمارا باپ تھا، اباقاآن نے کہا تمھارا باپ تو مرچکا ہے، بولے کہ پدر طریقت ہے، حضور نے سعدی کا نام سنا ہوگا، جن کی نظم ونثر آج تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے، وہی بزرگ ہیں، اباقاآن ملنے کا مشتاق ہوا، دوسرے دن دونوں بھائی شیخ کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور بادشاہ کا پیغام کہا، شیخ نے انکار کیا، لیکن ان لوگوں نے اس قدر اصرار کیا کہ شیخ کو چارناچار جانا پڑا، اباقاآن سے دیر تک صحبت رہی، چلتے چلتے اس نے کہا کہ مجھکو کچھ نصیحت فرماتے جائیے، شیخ نے کہا مرنے کے بعد صرف اعمال ساتھ جائیں گے، اب تم کو اختیار ہے کہ اچھے اعمال ساتھ لے جاؤ یا برے، اباقاآن نے کہا اس مضمون کو نظم کر دیجئے شیخ نے برجستہ کہا،

شہے کہ حفظِ رعیت نگاہ می دارد　　حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی ست
دگر نہ راعی خلق ست زہر مارش باد　　کہ ہرچہ میخورد از جزیت مسلمانی ست

اباقاآن کے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اور کہا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟ شیخ نے کہا اگر راعی ہو تو پہلا شعر حسب حال ہے، ورنہ دوسرا، اباقاآن بار بار پوچھتا تھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟ لیکن شیخ ہر بار وہی شرطیہ جواب دیتے رہے، چلتے ہوئے شیخ نے یہ اشعار پڑھے،

بادشہ سایۂ خدا باشد　　سایہ با ذات آشنا باشد
نہ شود نفس عامہ قابل خیر　　گر نہ شمشیر بادشا باشد
ملکت او صلاح نپذیرد　　گر ہمہ رائے او خطا باشد
ہر صلاحے کہ در جہاں آید　　اثرِ عدلِ بادشا باشد

اباقاآن پران اشعار کا نہایت اثر ہوا،

ایک دفعہ خواجہ شمس الدین نے چند سوالات لکھ کر شیخ کے پاس بھیجے اس کے ساتھ ایک عمامہ اور پانچسو اشرفیاں بھی بھیجیں، لیکن قاصد نے ڈیڑھ سو اشرفیاں خود اڑا لیں، شیخ نے سوالات کے جواب کے ساتھ اشرفیوں کی رسید بھی لکھی اور عجیب

لطیف طریقہ سے نوکر کی خیانت ظاہر کی،

چونکہ تشریفم فرستادی ومال　　مالت افزون باد وخصمت پائمال

ہر بہ دیناریت سالے عمر باد　　تا بمانی سیصد و پنجاہ سال

یعنی آپ کو خدا ہر اشرفی کے بدلے ایک برس عمر دے تاکہ آپ ۳۵۰ برس زندہ رہین،
خواجہ شمس الدین نے نوکر سے باز پرس کی، خواجہ علاء الدین (برادر خواجہ شمس الدین) نے
جلال الدین ختنی کو جو شیراز مین ایک معزز عہدہ پر مامور تھے، خط لکھا کہ دس ہزار اشرفیان
شیخ کی خدمت مین پہنچا دینا، سو اتفاق یہ کہ جب نوکر شیراز مین پہنچا تو اس سے چھ دن پہلے
جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا، نوکر نے جلال الدین کے نام کا خط شیخ کو لے جا کر دیا،
شیخ نے علاء الدین کو جواب مین یہ قطعہ لکھا،

پیام صاحب دولت علاء دولت و دین　　کہ دین و دہر بہ ایام او ہمے نازد

رسید پایۂ دولت فزود سعدی را　　بسے نماند کہ سر بر فلک بر افرازد

مثال داد کہ صدر ختن جلال الدین　　قبول خدمت او را تعہد سے سازد

ولیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود　　چنانکہ بر سر ابنائے دہر می تازد

جلال زندہ نخواہد شدن درین دنیا　　کہ بندگان خداوندگار بنوازند

طمع ندارم از و در سرائے عقبےٰ نیز　　کہ از مظالم مردم بہ ما بپردازند

یعنی اس کا تو چندان رنج نہین کہ جلال الدین اب زندہ نہین ہو سکتا کہ میری حق رسی
کر سکے، رونا یہ ہے کہ قیامت مین بھی اس کو اورون کی دادرسی سے اتنی فرصت کہان ہوگی
کہ ہم غریبون کی طرف متوجہ ہو،
خواجہ شمس الدین نے قطعہ پڑھ کر حکم دیا کہ فوراً پچاس ہزار اشرفیان شیخ کی خدمت مین

بھیج دی جائین، شیخ قبول نہین کرتے تھے، لیکن چونکہ خواجہ موصوف نے قسمین دلائی تھین، شیخ نے اس رقم سے ایک کاروان سرا تعمیر کرادی،[1]

خواجہ شمس الدین کو ارغون خان (ہلاکو خان کا پوتا) نے ۶۸۳ھ مین قتل کرادیا، ان کے بعد بھی شیراز کے تمام حکام اور امرا، شیخ کی اسی طرح عزت اور تعظیم کرتے رہے، ملک عادل شمس الدین تازی کے زمانہ مین عمال نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ سرکاری باغون کے پھل نہایت گران قیمت پر زبردستی دوکانداروں کے ہاتھ بیچتے تھے، اور بیچارون کو خواہ مخواہ مول لینا پڑتا تھا، شیخ کے بھائی بقالی کا پیشہ کرتے تھے، ان کی دوکان اتابک کے محل کے سامنے تھی، ان پر بھی چند بار یہ آفت آئی آخر مجبور ہو کر بھائی کے پاس آئے، شیخ نے یہ قطعہ لکھ کر ملک عادل کے پاس بھیجا،

زاحوال برادرم بہ تحقیق	دانم کہ ترا خبر نہ باشد
خرمای بہ طرح می دہندش	بخت بدازین بتر نہ باشد
اطفال برادرم ز درویش	خرما بخورند و زر نہ باشد
انگہ تو محصلی فرستی	شخصے کہ ازو بتر نہ باشد
چندان بزنندش اے خداوند	کز خانہ رہش بدر نہ باشد
اے صاحب من بغور او رس	لطفے بہ ازین دگر نہ باشد

ملک شمس الدین نے قطعہ پڑھنے کے ساتھ منادی کرادی کہ جن لوگون سے ایسا معاملہ کیا گیا ہے، سب دربار مین حاضر ہون، چنانچہ سب کی دادرسی کی، پھر شیخ کی خدمت مین آیا اور نہایت معذرت کی، ساتھ ہی ہزار اشرفیون کی تھیلی پیش کی کہ آپ کے بھائی کے

[1] یہ تمام حالات احمد بن بیستون نے کلیات شیخ کے دیباچہ مین لکھے ہین،

نقصان کا تاوان لے ہے،

شیخ نے آخر زندگی میں شہر سے باہر ایک زاویہ بنوا لیا تھا، رات دن وہیں رہتے تھے اور عبادت کرتے تھے، سلاطین اور امرا، اسی آستانہ پر حاضر ہوتے اور مراتب اخلاص بجالاتے، کھانے کا یہ انتظام تھا کہ امرا خود کھانے لیجاتے یا بھجوادیتے، شیخ جس قدر کھا سکتے کھا لیتے، باقی ایک زنبیل میں رکھ کر دیوار سے لٹکا دیتے کہ ع بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

شیخ جب شیراز میں واپس آئے تو ابوبکر بن سعد کی حکومت کا زمانہ تھا اس کے بعد اس کا پوتا محمد بن سعد بادشاہ ہوا لیکن چونکہ وہ نہایت صغیر سن تھا، حکومت کے سب کام اس کی ماں انجام دیتی تھی، دو برس ۷ مہینے کے بعد وہ مر گیا، اس کے بعد محمد شاہ بن سلغر بن اتابک سعد بادشاہ ہوا لیکن چونکہ سفاک اور خونریز تھا، اس لئے آٹھ مہینے کے بعد ارکانِ دولت نے اس کو گرفتار کر کے ہلاکو خاں کے پاس بھیجدیا، پھر اس کے بھائی نے برائے نام حکومت کی اور ۶۶۳ھ میں قتل کر دیا گیا، اب اس خاندان میں کوئی مرد باقی نہیں رہا تھا، آتش خاتون دختر اتابک سعد مسند حکومت پر بیٹھی، اس نے ہلاکو خاں کے بیٹے منکو تیمور سے شادی کر لی، ۶۸۶ھ میں وہ بھی مر گئی، اور اب شیراز د فارس براہ راست تاتاریوں کی زیر حکومت آگیا،

یہ ارغون خاں ابا قاآن خاں بن ہلاکو خاں کا زمانہ ہے، شیخ نے اس کے عہد حکومت میں ۶۹۱ھ میں وفات پائی، تاریخ وفات "خاص" کے لفظ سے نکلتی ہے، کسی نے اسکو موزوں کر دیا ہے، ع ز خاصان بود زاں تاریخ شد خاص،

شیخ کا مزار مقام دلکشا سے کچھ فاصلہ پر پہاڑ کی تلی میں ہے، اور اب سعدیہ کے

لہ دیباچہ کلیات،

نام سے مشہور ہے، ہفتہ میں ایک دن مقرر ہے، لوگ زیارت کو جاتے ہیں، دن بھر وہیں رہتے ہیں، چائے پیتے ہیں، لطف اٹھاتے ہیں اور شام کو چلے آتے ہیں،

عام حالات اور اخلاق و عادات

شیخ نے گو اپنے سوانح نہیں لکھے لیکن گلستاں اور بوستاں میں جستہ جستہ ضمنی موقعوں پر اس قدر حالات لکھدیئے ہیں، کہ اُن سے اخلاق اور عادات کی پوری تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے،

شیخ کا شمار صوفیہ کبار میں ہے اور بے شبہہ وہ پاکیزہ باطن اور صاحب حال تھے لیکن ان کی مخصوص حالت یہ ہے کہ وہ اس رتبہ پر مجاہدہ اور ریاضت کے بعد پہنچے تھے اُن کی اصلی سرشت یہ نہ تھی، بچپن سے شباب بلکہ ادھیڑپن کے زمانہ تک ان میں وہ اوصاف نظر آتے ہیں، جو مولویوں کا خاصہ ہیں، یعنی خود بینی، حرف گیری، مشاجرت و مخاصمت، باپ کی صحبت کے اثر سے بچپن میں عبادت کا ذوق شوق پیدا ہوگیا تو شب بیداری اور وردو وظائف میں مصروف ہیں لیکن ساتھ ہی اور وں پر حرف گیری بھی کرتے جاتے ہیں کہ دیکھئے کسی کو نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی،

نظامیہ میں حدیث پڑھتے ہیں، کسی نے ان کے خلاف کچھ کہدیا ہے، اس پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں،

چو من داد معنی وہم در حدیث　　　بر آید ہم اندرونِ خبیث

ایک درویش سے دولت مندی اور درویشی کے متعلق بحث کرتے کرتے دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور دھول دھپہ تک نوبت پہنچا دیتے ہیں؛

دشنامم داد سقطش گفتم گریبانم درید زنخدانش شکستم،

حج کا سفر ہے، ذوق و شوق میں احرام باندھے پا پیادہ جا رہے ہیں، اس حالت

مین بھی زبان سے ناسزا کلمات نکل رہے ہین، چنانچہ خود فرماتے ہین،

درسروروی ہمدیگر فتادیم ، داد فسق وجدال دادیم،

حسن پسندی، امرد پرستی تک پہونچ گئی ہے اور ایسے کھل کھیلے ہین کہ اس کا ذکر تک نہین کیا جا سکتا،

بے شبہہ یہ باتین ان کے عارضِ کمال کے داغ ہین لیکن ایک رفارمر اور مصلح کے لئے ان تمام مراحل سے گذرنا ضرور تھا،

مولینا روم سے کسی نے ایک بزرگ کی نسبت کہا کہ "شاہد باز بود اما پاکباز بود" مولینا نے کہا "کاوش کردی وگذاشتی"

شیخ نے چونکہ بیماریان اٹھا کر صحت پائی تھی، اس لئے وہ امراض (اخلاقی) کی حقیقت، ماہیت، علامات اور طریقِ علاج سے جس قدر واقف ہو سکے دوسرا نہین ہو سکتا تھا، اخلاقی بیماریون مین اکثرون کو دھوکا ہوتا ہے، اور مرض کو مرض نہین سمجھتے، مثلاً ایک فقیہ فطری بدنفسی کی وجہ سے اپنے مخالف کو برا کہتا ہے اور اسکو ضرر پہنچاتا ہے، لیکن اس کا نفس اسکو یہ دھوکا دیتا ہے کہ چونکہ یہ شخص فلان مسئلہ کا قائل ہے، بدعتی اور کافر ہے، اس لئے اس کو برا کہنا اور اس کی تکفیر کرنا غیرت مذہب کا اقتضا ہے، یا مثلاً ایک صوفی صاحب امرد پرستی کرتے ہین اور سمجھتے ہین، کہ یہ مجاز حقیقت کا زینہ ہے، شیخ ان غلطیون مین نہین پڑ سکتا چنانچہ امرد پرستی کی نسبت، نظر باز صوفیون کی اس طرح پردہ دری کرتا ہے،

گروہے نشینند با خوش پسر | کہ ما پاکبازیم واہلِ نظر
زمن پرس فرسودۂ روزگار | کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار
چرا طفل یک روزہ ہوشش نبرد | کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد

شیخ کے مزاج مین ظرافت حد سے زیادہ تھی، ایک دفعہ ایک مکان کرایہ پر لینا چاہتے تھے، ایک یہودی پڑوس مین رہتا تھا، اس نے کہا ضرور خرید ئیے مین اس مکان کی حالت سے خوب واقف ہون، اس مین کوئی عیب نہین، شیخ نے کہا بجز اس کے کہ آپ اس کے ہمسایہ ہین،

همام خواجہ ہمام ایک مشہور شاعر تھے اور محقق طوسی کے شاگرد تھے، شیخ سے اور ان سے تبریز مین ایک حمام مین ملاقات ہوئی، شیخ نے دانستہ ہمام سے چھیڑ چھاڑ شروع کی ہمام ان سے واقف نہ تھے، نام اور نشان پوچھا، شیخ نے کہا شیراز مین رہتا ہون، ہمام نے کہا عجیب بات ہے، ہمارے شہر مین شیرازی کتون سے زیادہ ہین، شیخ نے کہا ہان لیکن شیراز مین تو تبریزی کتے سے بھی کم (رتبہ) ہین، اتفاق یہ کہ ایک خوشرو جوان ہمام کو پنکھا جھل رہا تھا، شیخ اس سے لطف نظر اٹھانا چاہتا تھا، لیکن ہمام بیچ مین حائل تھے، ہمام نے سلسلۂ سخن مین کہا کہ شیراز مین ہمام کے شعر کا بھی چرچا ہے؟ شیخ نے کہا ہان یہ شعر اکثر زبانون پر ہے،

درمیانِ من و دلدار حجاب ست ہمام وقت آن است کہ این پردہ بیک سو فگنم

ہمام کو گمان ہوا کہ یہ سعدی ہین، قسم دلاکر پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے، شیخ نے مجبوراً بتایا، ہمام نے اٹھکر شیخ کے پاؤن پر سر رکھ دیا، گھر لے گئے، اور بڑی گرمجوشی سے مہمانیان کین[۱]،

ہمگر مجدالدین ہمگر شیخ کے معاصر اور اسی دربار کے تعلق رکھتے تھے، جس سے شیخ کو تعلق تھا، آج تو کوئی ان کا نام بھی نہین جانتا، لیکن اس زمانہ مین فارس کے ملک الشعرائی کا منصب جو شیخ کا حق تھا، قسمت نے ان کو عنایت کیا تھا،

[۱] دولت شاہ ذکر سعدی،

سعد بن ابوبکر سعد زنگی ان کی تعظیم اور تکریم شیخ سے زیادہ کرتا تھا، اسی زمانہ میں امامی
ایک شاعر تھا، زمانہ کی بے بصری نے ان کو بھی شیخ کا حریف بنا دیا تھا، نوبت یہانتک
پہنچی کہ خواجہ شمس الدین محمد اور ملک معین الدین پروانہ اور نور الدین اور افتخار الدین نے
یہ قطعہ لکھ کر مجد الدین ہمگر کے پاس بھیجا،

ز شمع فارس، مجد ملت و دیں — سوالے می کند پروانۂ روم
ز شاگردانِ تو ہستند حاضر — رہی و افتخار و نور مظلوم
تو از اشعار سعدی و امامی — کدامی بہ پسندی اندریں بوم

مجد الدین نے جواب میں لکھا،

ما گرچہ بہ نطق طوطی خوش نفسیم — بر شکر گفتہ ہائے سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری باجماع امم — ہرگز من و سعدی بامامی نرسیم

شیخ کو بھی اس بے امتیازی کا رنج ہوا، چنانچہ یہ رباعی لکھی،

ہر کس کہ بہ بارگاہ سامی نرسد — از بخت سیاہ و بد کلامی نرسد
ہمگر کہ بہ عمر خود نکردہ است نماز — شک نیست کہ ہرگز بامامی نرسد[1]

شیخ کے سیر و سفر کے ذکر میں جو واقعات ہم اوپر لکھ آئے ہیں، ان کو اس موقع پر
دوبارہ پڑھنا چاہئے، جن سے شیخ کے اخلاق و عادات کی تصویر، پوری نظر میں آجائیگی،

شیخ کی تصانیف | کلیات[2] شیخ کے (کا) قدیم ترین قلمی نسخہ کتب خانہ دیوان ہند (INDIA OFFICE)
میں موجود ہے، جس کا نمبر ۱۱۱۷ ہے، تاریخ استنساخ اول رجب ۷۲۸ھ یعنی شیخ کی وفات

---

[1] تذکرہ دولت شاہ تذکرہ امامی مروی [2] یہ تمام مضمون شیخ عبد القادر صاحب ایم اے، پروفیسر
دکن کالج پونا نے ترجمہ کرکے ہم کو عنایت کیا ہے،

کے بعد قریب ۷۰ سال ہے، کاتب کا نام ابوبکر بن علی بن محمد ہے، جس نے شیخ کے اصلی نسخہ سے نقل لی ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے "منقول من خط الشیخ العارف السعدی"

اس نسخہ سے شیخ کا نام شرف الدین بن مصلح الدین پایا جاتا ہے اور اس میں حسب ذیل کتابیں ہیں (۱) عربی قصیدہ قافیہ میم (۲) دو سرا رسالہ (۳) بوستان جس کا نام یہاں سعدی نامہ لکھا ہوا ہے (۴) گلستاں (۵) طیبات (۶) بدائع (۷) خواتیم (۸) قصائد فارسیہ (۹) مراثی (۱۰) ملمعات (۱۱) مثلثات (تین زبانوں میں عربی، فارسی اور ترکی) (۱۲) قصائد عربیہ (۱۳) ترجیعات (۱۴) مقطعات (۱۵) مجلس ہزل، ہزلیات، (۱۶) مطایبات (۱۷) رباعیات (۱۸) مفردات،

جو کتابیں کہ اس نسخہ میں داخل نہیں وہ یہ ہیں، رسائل ۱، ۳، ۴، ۵، ۶ غزلیات قدیم صاحبیہ مضحکات،

اہل یورپ نے شیخ کے کلام کے جو حصے شائع اور ترجمے کئے، اس کا مختصر حال یہ ہے (ماخوذ از فہرست کتب قلمی فارسی موجودہ دیوان ہند، مرتبہ ڈاکٹر ایتھ (Dr Ethe)

رسالہ دوم، پانچ مجلسوں میں سے تیسری اور چوتھی مجلسیں ایم اگوڈمان (M. Goedeman) صاحب نے معہ ترجمہ اور شرح کے شائع کیں بمقام بریسلا (Bresla) ۱۸۹۸ء

بوستان، نہایت نفیس اڈیشن معہ شرح فارسی کے ایچ گراف جناب (K. H Graff) کے اہتمام سے چھپا ہے بمقام ویانا (Vienna) ۱۸۵۰ء،

متن مع نوٹس، مرتبہ اے راجرس (A Rodgers) بمقام لندن ۱۸۹۱ء،

تراجم، در زبان جرمن، کے ایچ گراف (K. H Graff) صاحب کا ترجمہ، جینا (Jena) ۱۸۵۰ء

" در زبان جرمن شیلخنا دیسرڈ (Schlechta wesschrd) (وینا) (Vienna) ۱۸۵۲ء

تراجم درزبان جرمن روکٹ (Ruckert) صاحب کا ترجمہ لیپزنگ (Liepzing) سنہ ۱۸۸۲ء

تراجم دزبان فرنچ، باربیر دی مینارڈ (Barbierdeoneynard) کگیارس سنہ ۱۸۸۰ء

تراجم انگریزی، ایچ، ولبرفورس کلارک (H. Willeforce CLARK) صاحب کا ترجمہ بمقام لندن سنہ ۱۸۷۹ء

تراجم انگریزی جی، ایس، ڈیوی (G. S. Davia) صاحب کا ترجمہ بمقام لندن سنہ ۱۸۸۲ء

منتخبات مترجمہ رابنسن (Robinson) لندن سنہ ۱۸۸۳ء

ایک ترکی میں بمقام قسطنطنیہ سنہ ۱۲۹۸ میں شائع ہوا ہے،

گلستان، اڈیشنس، گلیاڈون (Gladwin) صاحب کی متن مع انگریزی کلکتہ سنہ ۱۸۰۶ء

" " ای، بی، ایسٹوک (E. B. Eastwick) صاحب کی مع فرہنگ بمقام ہرٹ فرڈ (Hertford) سنہ ۱۸۵۰ء،

" " جانسن (Johnson) کی مع فرہنگ، ہرٹ فرڈ سنہ ۱۸۶۳ء،

" " جے، ٹی، پلاٹس (J. T. Platts) لنڈن سنہ ۱۸۷۴ء،

تراجم، در فرنچ، اے، ڈیورائر (A. Du Ryer) کا ترجمہ سنہ ۱۶۳۱ء،

ڈالیگر (Dalegre) کا ترجمہ سنہ ۱۷۱۴ء

گاندان (Gaundin) کا ترجمہ سنہ ۱۷۸۹ء

سیمیلٹ (Semelet) کا ترجمہ سنہ ۱۸۵۸ء پارس

لاطینی جنٹیس (Gentius) کا ترجمہ سنہ ۱۶۵۱ء اڈیشن دوم سنہ ۱۶۵۵ء،

تراجم، در جرمن، ادم اولیاری (Adam olearius) کا بمقام شلیسوگ (Schlesswig) سنہ ۱۶۵۴ء

تراجم در جرمن بی ڈارن (B. Dorn) صاحب کا، ہامبرگ ۱۸۲۲ء

" " وولف (Wolf) کا سٹٹگارٹ (Stuttgart) ۱۸۴۱ء

" " کے ایچ گراف (K. H. Graff) کا لیپزگ ۱۸۴۶ء

تراجم در انگریزی، گلیاڈون صاحب (Gladwin) کا کلکتہ ۱۸۰۶ء

لندن ۱۸۳۳ء

دیو مولن (Dumoulin) کا ۱۸۰۶ء

جیمس راس (James Ross) کا لندن ۱۸۲۳ء

نیا ایڈیشن ۱۸۹۰ء،

ای، بی، ایسٹوک (E. B. Eastwick) ہرٹ فرڈ ۱۸۵۲ء

نیا ایڈیشن، لندن ۱۸۸۰ء

جی، ٹی، پلاٹس (J. T. Platts) کا لندن ۱۸۶۳ء

تراجم در روسی، اس، نسرنیز (S. Nazarianz) کا ماسکو ۱۸۵۷ء

تراجم در پولش، آٹو نوسکی (Otwinowski) کا، وارسا ۱۸۷۹ء

تراجم در ترکی، قسطنطنیہ میں ۱۸۶۴ء ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا اور مع شرح سودی کے

تراجم ۱۲۸۶ء اور ۱۲۹۳ء میں،

عربی میں بمقام بولاق ۱۲۶۳ء ہندوستانی میں میر شیر علی افسوس کا کلکتہ ۱۸۵۲ء

جو زیر نگرانی جان گلگرسٹ صاحب (John Gilchrist) کے شائع کیا گیا۔

طیبات کی چودہ غزلیں گراف (K. H. Graff) صاحب نے ترجمہ کرکے جرمن میں شائع کیں۔

بدائع دس " " " " " "

خواتیم کی سات غزلیں گراف (H. Graff) صاحب نے ترجمہ کر کے جرمن میں شائع کیں،

قصائد فارسیہ کچھ ایس قصائد، " " " " " " " "

مراثی، چند مراثی " " " " " " " "

رباعیات چند رباعیات " " " " " " " "

مفردات، کو لاٹوش (Latouche) صاحب نے ایڈٹ اور شائع کیا ہے،

صاحبیہ، کو باخر (Bacher) صاحب نے مع ترجمہ شائع کیا ہے، اسٹراسبرگ (Strassburg) ۱۸۷۹ء

شیخ کی شاعری

شریعت شعر کے تین پیغمبر ہیں، ان میں ایک شیخ بھی ہیں،

در شعر سہ تن پیمبرانند — ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

ہر پیغمبر، جداگانہ شریعت کا پیغمبر ہے، شیخ کی پیغمبری کا صحیفہ غزل ہے خواجہ حافظ نے غزل کو معجزہ بنا دیا تاہم کہتے ہیں، ع

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما

حضرت امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غزل میں سعدی کا پیرو ہوں، مثنوی نہ سپہر میں لکھتے ہیں،

تا بجاے کہ حد پارسیاں — اندریں عہد دو تن گشت عیاں

زاں یکے سعدی ثنا نیش ہمام — ہر دو را در غزل آئیں تمام

لیکن اور اصناف سخن میں شیخ کی شاعری اس درجہ پر تسلیم نہیں کی گئی، امیر خسرو شیخ کی غزل گوئی کی تعریف کر کے لکھتے ہیں،

لیک اگر سوے وگر بازی دست   شعر شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

خود شیخ کے زمانہ میں بھی اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا، اور اس کا چرچا شیخ تک بھی پہنچا، چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ شیخ اخلاق اور وعظ کے مضامین اچھے لکھ سکتے ہیں لیکن رزم کے مرد میدان نہیں،

کہ فکرش بلیغ است ورائش بلند   دریں شیوۂ زہد وطامات وپند

نہ در خشت وگوپال وگرز گراں   کہ ایں کار ختم ست بر دیگراں

شیخ کو یہ راے ناگوار گذری، ایک رزمیہ داستان لکھ کر بوستان میں شامل کی جس میں بہت کچھ زور طبع دکھایا، نظامی کے خاص خاص مشہور مضامین اور اشعار کا جواب بھی لکھا اور اُن سے بڑھا دینا چاہا، مثلاً نظامی کا شعر تھا،

کمند اژدہاے مسلسل تشکنج   دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

شیخ اس تشبیہ کو زیادہ صاف اور صورت نما کرتے ہیں،

بہ صید ہژبران پرخاش ساز   کمند اژدہاے دہن کردہ باز

لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ سے یہ کمان زہ نہیں ہوسکی، دو چار قدم تن کر اور اکڑ کر چلتے ہیں، لیکن پھر طبعی بڑھاپے کے ضعف سے دفعۃً جھک جاتے ہیں، رزم کا آغاز کس زور وشور سے کیا ہے،

ع برانگیختم گرد ہیجا چو دود

لیکن دوسرے ہی قدم میں لڑکھڑا کر گرتے ہیں،

ع چو دولت نہ باشد تہور چہ سود،

باایں ہمہ چونکہ شیخ کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے، ہم اس رزمیہ کے چند اشعار

نقل کرتے ہیں،

ہماندم کہ دیدیم گرد سیاہ | زرہ جامہ کردیم و مغفر کلاہ
چو ابر اسپ تازی برانگیختیم | چو باراں پلالک فرو ریختیم
دو لشکر بہم بر زدند از کمیں | تو گفتی زدند آسماں بر زمیں
ز باریدنِ تیر ہمچوں تگرگ | ز ہر گوشہ برخاست طوفانِ مرگ
بہ صید ہزبرانِ پرخاش ساز | کمند اژدہاے دہن کردہ باز
زمیں آسماں شد ز گرد کبود | چو انجم در و برق شمشیر و خود

غرض نہ ان کا یہ دعوی مسلّم ہے کہ وہ رزم میں فردوسی اور نظامی کے دوش بدوش چل سکتے ہیں، نہ امیر خسرو وغیرہ کی یہ راے صحیح ہے کہ وہ غزل کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتے قصائد اور مثنوی میں انکی بلند پائگی سے کون انکار کرسکتا ہے،

ایران میں شاعری کو تین سو برس گذر چکے تھے لیکن شاعری اب تک اصلی جادہ پر نہیں آئی تھی، شاعری کی اصلی حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہو، اور وہ اس جذبہ کو اُسی جوش و خروش سے ادا کردے، جس جوش سے وہ پیدا ہوا تھا، فردوسی نظامی، فرخی، انوری کے کمال شاعری میں کس کو کلام ہے، لیکن ان میں سے اپنے دل کے جذبات کس نے لکھے؟ فردوسی قدرتی شاعر ہے، اس لئے وہ غیروں کے جذبات بھی اُسی طرح ادا کرتا ہے کہ گویا خود اس کے دل سے اٹھے ہیں، عرب کی تحقیر اور طعن کے وقت وہ خود یزدگرد بن جاتا ہے، سہراب کی ماں کا نوحہ اس درد سے لکھا ہے کہ گویا اس کو سہراب کی ماں کی زبان ہاتھ آگئی ہے، لیکن فرض کرو یہ واقعات خود فردوسی پر پیش آتے تو کیا ان شعلوں کی شرر فشانی اور نہ بڑھ جاتی، جذبہ

قصائد تو بالکل ہی تصنع اور آورد تھی، غزل بھی اس وقت تک گویا قصیدہ ہی کی ایک دوسری صورت تھی عشق و محبت کے جذبات اس میں ادا نہیں کئے جاتے تھے، بلکہ جس طرح مدحیہ قصائد میں ممدوح کی شجاعت و قدرت، جود و سخا، تلوار اور گھوڑے کی مدح کرتے تھے، غزل میں معشوق کے حسن اور اعضا کے اوصاف بیان کرتے تھے، شیخ پہلا شخص ہے جس نے شاعری کا صحیح استعمال کیا، تفصیل اسکی حسب ذیل ہے،

آزادی (۱) سب سے بڑی چیز جو شیخ کی خصوصیات شاعری میں ہے، آزادی ہے، عرب کی شاعری کی اصلی روح یہی تھی، جو عجم میں آکر گم ہو گئی تھی، عرب کے شعرا سلاطین اور امرا کے متعلق ہر قسم کے خیالات نہایت آزادی سے ادا کرتے تھے، متنبی سیف الدولہ کی مدح لکھ کر سے جاتا ہے اور ساتھ ہی نہایت گستاخی اور بیباکی سے اس کو صلواتیں سناتا جاتا ہے، فردوسی نے بھی محمود کی جاں خروش ہجو لکھی، لیکن رو در رو نہیں بلکہ چوری سے پھر تمام عمر بھاگتا پھرا، شیخ کو کئی درباروں سے تعلق رہا، ابوبکر سعد زنگی اس کا خاص ممدوح اور آقا تھا، انکیانو جو خاندان اتابک کے خاتمہ کے بعد ہلاکو خاں کے جانشین کی طرف سے شیراز کا گورنر تھا، اس سے بھی شیخ کو تعلق رکھنا پڑتا تھا، ان سب کے مقابلہ میں اُس نے اپنی آزادی قائم رکھی، ابوبکر بن سعد نے ہلاکو خاں کی اطاعت قبول کر لی تھی، یہانتک کہ جب ہلاکو خاں نے بغداد پر چڑھائی کی تو ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد کو فوج دیکر اعانت کے لئے بھیجا، اور جب بغداد تاراج ہوا، تو ابوبکر نے مبارک باد کے لئے سفارت بھیجی، بایں ہمہ شیخ نے بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا اور اس قدر پر اثر لکھا کہ لوگوں کے دل ہل گئے، یہ مرثیہ درحقیقت ابوبکر بن سعد زنگی کی ہجو تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور

بربادی میں ہلاکو خاں کا ساتھ دیا، شیخ نے اس مرثیہ میں ابوبکر کا بھی ذکر کیا اور ہجو ملیح کے طور پر مدح کے پیرایہ میں چوٹ کی،

خسرو صاحبقراں غوثِ زماں بوبکر سعد | آنکہ اخلاقش پسندیدہ ست و اوصافش گزیں
مصلحت بود اختیار رای روشن بینِ او | زیردستاں را سخن گفتن نشاید جز چنیں

یعنی ابوبکر نے جو ہلاکو کی مدد کی تو اس میں کچھ مصلحت ہو گی،

انکیانو کی مدح میں شیخ کے متعدد قصیدے ہیں، لیکن ہر قصیدہ میں نہایت دلیری سے اُس کو نصیحت کی ہے اور صاف کہدیا ہے کہ جس کو دربار کی طمع نہیں وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈر سکتا،

سعدیا چندانکہ میدانی بگو | حق نباید گفتن الا آشکار
ہر کرا خوف و طمع دربار نیست | از خطا باکش نباشد و ز تتار
خسرو عادل امیر نامور | انکیانو خسرو عالی تبار

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

حرامش باد ملکِ بادشاہی | کہ پیشش مدح گویند از قفا ذم
جہاں سالار عادل انکیانو | سپہدار عراق و ترک و دیلم
چنیں پند از پدر نشنیدہ باشی | الا گر ہوشیاری بشنو از عم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ | سخن ملکے است سعدی را مسلم

بوستاں میں لکھتے ہیں،

دلیری آمدی سعدیا در سخن | چو تیغیت بدست است فتحے بکن
بگو انچہ دانی کہ حق گفتہ بہ | نہ رشوت ستانی و نہ رشوہ دہ

طمع بندو دفتر زحکمت بشوے   طمع بگسل و ہر چہ خواہی بگوے

اس زمانہ میں شاعری کا بڑا حصہ مدح تھی اور شعرا اسی کے ذریعہ سے بسر کرتے تھے شاعری کی بڑی اصلاح یہ تھی کہ شاعری کے چہرہ سے یہ داغ مٹادیا جائے، شیخ نے یہ فرض نہایت نفس کشی کے ساتھ ادا کیا، وہ تنگ حال اور مفلس تھا لوگ اس کو ترغیب دیتے تھے کہ مدحیہ قصائد لکھو تو اچھی طرح بسر ہوگی وہ جواب دیتا تھا کہ آزاد گردن کسی کے آگے جھک نہیں سکتی،

گویند سعدیا بچہ بطال ماندۂ   سختی مبر کہ وجہ کفاف معین است
یکچند اگر مدیح کنی کامراں شوی   صاحب ہنر کہ مال ندارد تغابن است
بی زر میسرت نشود کام دوستاں   چوں کام دوستاں نہی کام دشمن است
آرے مثل بہ کرگس مردار خور دہند   سیمرغ راکہ قاف قناعت نشیمن است
از من نیاید ایں کہ بہ دہقان و کدخدا   حاجت برم کہ فعل گدایان خرمن است

عرب میں مدح کے یہ معنی تھے کہ شاعر جس شخص کا ممنون ہوتا تھا یا جو شخص قوم میں قابلِ مدح کام کرتا تھا، شاعر اس کا اظہار کرتا تھا لیکن صلہ اور انعام سے اس کو کچھ واسطہ نہ ہوتا تھا،

زہیر بن ابی سلمےٰ جب ہرم بن سنان کے دربار میں گیا، اور ہرم کو سلام کیا تو ہرم نے حکم دیا کہ زہیر جب دربار میں آئے اور سلام کرے تو اس کو صلہ دیا جائے اس کے بعد زہیر کا معمول ہوگیا کہ جب دربار میں جاتا تو کہتا کہ تمام مجمع کو سلام کرتا ہوں لیکن ہرم کو نہیں، عرب میں سب سے پہلے جس شاعر نے قصیدہ پر صلہ لیا وہ نابغہ ذبیانی تھا، عرب نے اس کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھا،

شیخ نے مدحیہ قصائد کو عرب کے قدیم انداز پر لانا چاہا، اس نے سلاطین و امراء کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں لیکن ان کے صحیح اوصاف بیان کرتا ہے، اور مبالغہ آمیز خیالات جو مدحیہ قصائد کے عنصر میں داخل ہو گئے تھے ان کو لغو بتاتا ہے، مثلاً قصیدہ کے خاتمہ میں ممدوح کو یوں دعا دیتے تھے، کہ لاکھوں کروڑوں برس زندہ رہے، یہاں تک کہ مرزا غالب نے قصہ ہی فیصل کر دیا، ع تا خدا باشد بہادر شاہ باد

شیخ ہزار برس کی دعا دینے پر بھی راضی نہیں،

ہزار سال نگویم بقاے عمر تو باد — کہ این مبالغہ دانم ز عقل نشماری

ہمین سعادت توفیق بر مزیدت باد — کہ حق گزاری و ناحق کسے نیازاری

نہ کاہد انچہ نوشتہ است عمر و نفزاید — پس اینچہ فائدہ گفتن کہ تا بہ حشر بپای

ممدوح کو عموماً ابر گہرفشاں اور دریاے بیکراں کہا کرتے ہیں، شیخ کہتا ہے،

نہ گویمت چو زبان آوران رنگ آمیز — کہ ابر مشک فشانی و بحر گوہر زاے

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

من این غلط نہ پسندم ز رای روشن خویش — کہ دست و طبع تو گویم بہ بحر و کان ماند

یہ انوری کے اس شعر پر تعریض ہے،

گر دل بحر و دست کان باشد — دل و دست خدایگان باشد

مجد الدین رومی کی مدح میں کہتے ہیں،

نگویمت بہ تکلف فلان دولت و دین — سپہر مجد و معالی جہان دانش و داد

خواجہ شمس الدین محمد اور علاء الدین کا تمام دنیاے اسلام پر احسان تھا، تاتاریوں کے آشوب ناک زمانہ میں اسلام کی جو کچھ حالت قائم رہ گئی، وہ انہی بھائیوں کی

بدولت تھی اس لئے شیخ ان دونوں بھائیوں کی مدح نہایت اخلاص سے کرتا ہے لیکن بالکل اسی طرح جس طرح آج کسی گورنر یا حاکم صوبہ کو سچا سپاسنامہ پیش کیا جاتا ہے مثلاً مثلاً خواجہ علاء الدین کی مدح میں کہتا ہے،

خدای خواست کہ اسلام در حمایت او ۔۔۔ زشیر حادثہ در بارۂ اماں ماند

وگرنہ فتنہ چناں کردہ بود دنداں تیز ۔۔۔ کزیں دیار نہ مرغ و نہ آشیاں ماند

تو آں جواد زمانی کز ازدحام زماں ۔۔۔ ورت بہ مشرب شیریں کارواں ماند

جذبات (۲) شیخ کی شاعری عموماً جذبات سے لبریز ہے، وہ شاعری کی کسی صنف کو رسم اور تقلید کی حیثیت سے نہیں برتتا، وہ جانتا ہے کہ شاعری کا اصلی عنصر جذبات ہیں، اس لئے وہ اسی وقت شعر کہتا ہے، جب اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے، غزل اس وقت تک محض معشوق کی مداحی تھی، شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کئے جن لوگوں کا اس نے مرثیہ لکھا وہ لوگ تھے جن کے مرنے سے اسکو سخت صدمہ پہنچا تھا، اخلاقی مضامین بھی وہ اسی وقت ادا کرتا ہے، جب کسی موثر واقعہ کے پیش آجانے سے خود اس کے دل پر سخت اثر پڑتا ہے مثلاً

شنیدم کہ بلرزد چو یاد آورم ۔۔۔ مناجات شوریدۂ در حرم

کہ می گفت و فرماندہش می فروخت ۔۔۔ یکم روز بر بندۂ دل بسوخت

مرا رفتے در دل آمد بریں ۔۔۔ کہ پاک است و خرم بہشت بریں

دراں جائے پاکان امیدوار ۔۔۔ گل آلودۂ معصیت را چہ کار

امراء میں سے اس کو سب سے زیادہ محمد بن ابی بکر بن سعد زنگی سے محبت تھی، وہ نہایت ہنرور اور شوکت و شان کا شہزادہ تھا، وہ سفر میں تھا کہ باپ کے مرض الموت

کی خبر سنی اضطراب اور سراسیمگی کی حالت میں شیراز کو روانہ ہوا لیکن راہ میں قضا کر گیا،
چونکہ وہ ولیعہد تھا سب لوگ منتظر تھے کہ وہ آکر تخت و تاج کا مالک ہوگا، اس بنا ر
پر اس کے مرنے کا عام ماتم ہوا، شیخ کو بھی سخت صدمہ ہوا، اسی حالت میں مرثیہ لکھا،
جس کے ہر شعر سے خونِ جگر کی بو آتی ہے،

برزگان چشم و دل در انتظارند — عزیزاں وقت و ساعت می شمارند
غلامان دُرّ و گوہر می فشانند — کنیزاں دست و ساعد مے نگارند
ملک خانِ سیاق و بدر و تر خاں — بہ رہوارانِ تازی بر سوارند
کہ شاہنشاہ عادل سعد بوبکر — بہ ایوانِ شہنشاہی در آرند
حرم شادی کناں بر طاق ایواں — کہ مروارید بر تاجش بہ بارند
امید تاج و تخت خسروی بود — ازیں غافل کہ تابوتش در آرند
چہ شد پاکیزہ رویان حرم را — کہ بر سر کاہ و بر زیور غبار ند
نمی دانم حدیث نامہ چون است — ہمی دانم کہ عنوانش بہ خون است

مرثیہ کی اصلاح

(۳) اس وقت تک مرثیہ کا عام انداز یہ تھا کہ اشخاص کا مرثیہ لکھتے تھے، قومی
یا ملکی مرثیہ کا مطلق رواج نہ تھا، شیخ پہلا شخص ہے، جس نے قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا،
عباسیوں کی سلطنت گو اب برائے نام رہ گئی تھی، پھر بھی پانچسو برس کی اسلامی یادگار تھی،
اور بغداد تمام اسلامی دنیا کا مرکز تھا، اس لئے اس کا مٹنا قوم کا مٹنا تھا، شیخ نے اس
بنا پر خلیفہ اور بغداد اور سلطنت کا مرثیہ لکھا اور جس دل سے لکھا اس کا اندازہ ان
اشعار سے خود کر سکتے ہو،

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں — بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں

اے محمدؐ! گر قیامت سر بروں آری زخاک | سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں
نازنینانِ حرم را موج خونِ بے دریغ | ز آستاں بگذشت و ما را خونِ دل از آستیں
دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکتِ بیت الحرام | قیصرانِ روم سر بر خاک و خاقاں بر زمیں
خونِ فرزندانِ عمِ مصطفٰے شد ریختہ | ہم برآں خاکے کہ سلطاناں نہادندی جبیں
باش تا فردا بہ بینی روز داد و رستخیز | کز لحد با زخم خوں آلودہ برخیزد دفیں

ان اجمالی اور سرسری خصوصیات کے بعد ہم ان انواعِ شاعری سے مفصل بحث کرتے ہیں، جن کو شیخ نے ترقی دی یا اس کا رنگ بدل دیا،

اخلاقی شاعری (۴) اخلاقی شاعری شیخ سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، حکیم سنائی، خیام، اوحدی، عطار نے اس زمین کو آسمان تک پہونچا دیا تھا، تاہم شیخ نے اس آسمان کو اور بلند کر دیا، اخلاقی شاعری پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے،

(۱) کس قسم کے اخلاق کی تعلیم کی، اور ان میں کس حد تک فلسفیت اور نکتہ سنجی پائی جاتی ہے،

(۲) فلسفۂ اخلاق کو کس طرح شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اخلاقی مسائل اگر محض سادہ طریقہ پر نظم میں ادا کر دیئے جائیں تو وہ فلسفہ ہوگا شاعری نہ ہوگی، شیخ نے اخلاقی عنوان جو اختیار کئے وہ حسبِ ذیل ہیں،

عدل و تدبیر، احسانِ عام، عشق و محبت، تواضع، رضا بالقضاء، قناعت، تربیت، شکر، توبہ، مناجات،

عدل و تدبیر اصل میں پالیٹکس اور سیاست سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن چونکہ ان کو اخلاق سے نہایت قوی تعلق ہے، شیخ نے اس کو بھی اخلاق میں شامل کر دیا، ایشیائی ملکوں میں

سلطنت کی بنیاد بادشاہ پرستی پر قائم ہوتی ہے، اور وہ حاکم علی الاطلاق سمجھا جاتا ہے اگر وہ عدل وانصاف کرے تو اس کی عنایت ہے، اور نہ کرے تو اس کو کوئی ٹوک نہیں سکتا،

اگر شہ روز را گوید شب است ایں   بباید گفت اینک ماہ و پرویں

لیکن شیخ نے مختلف حکایتوں کے پیرایہ میں بتایا کہ ہر شخص کو نہایت آزادی کیساتھ بادشاہ پر نکتہ چینی کا حق ہے، شیخ نے آزادانہ اعتراض کو جس پیرایہ میں ادا کیا، آزادی، بیباکی اور جانبازی کی اس سے بڑھکر تعلیم نہیں ہوسکتی،

ایک ظالم بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ لوگوں کے جانور زبردستی پکڑ کر ان سے کام لیتا تھا، اتفاق سے ایک دن شکار کے پیچھے فوج کا ساتھ چھوٹ گیا، اور ایک گاؤں میں رات بسر کرنی پڑی، ایک شخص کو دیکھا کہ اپنے گدھے کو اس طرح مار رہا ہے کہ اس کے ہات پاؤں بیکار ہوئے جاتے ہیں، بادشاہ نے روکا، اس نے کہا میں اس لئے اسکو بیکار کئے دیتا ہوں کہ ہمارے ملک کا بادشاہ بیگار میں نہ پکڑے، یہ کہکر بادشاہ کو خوب بُرا بھلا کہا، صبح کو اہل فوج ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے گاؤں میں پہنچے، اور بادشاہ تختگاہ میں واپس آیا، یہاں پہونچ کر اس نے اس شخص کو پکڑ بلایا اور رات کی گستاخی کی سزا دینی چاہی، اس نے کہا

نہ تنہا منت گفتم اے شہریار   کہ برگشتہ بختی و بدروزگار

چہ اخشم بہ من گرفتی و بس   منت پیش گفتم ہمہ خلق پس

یعنی مجھ ہی پر کیوں غصہ ہے، تجکو تو سب برا کہتے ہیں، فرق یہ ہے کہ لوگ پیچھے بُرا کہتے ہیں، میں نے سامنے کہا،

چو بیداد کردی توقع مدار | کہ نامت بہ نیکی رود در دیار
ترا چارہ از ظلم برگشتن است | نہ بیچارۂ بے گنہ کشتن است

یعنی تجھ کو یہ مناسب ہے کہ ظلم سے باز آئے یہ نہیں کہ ایک بے گناہ کو قتل کر دے،

زنا مہربانی کہ در دورتست | ہمہ عالم آوازۂ جورتست
عجب گر منت بر دل آمد درشت | بکش گر توانی ہمہ خلق کشت
بداں کے ستودہ شود بادشاہ | کہ خلقش ستایند در بارگاہ
چہ سود آفریں بر سر انجمن | پس پردہ نفریں کناں مرد وزن
ہمی گفت و شمشیر بالاے سر | سپر کردہ جاں پیش تیر قدر

ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش کی حق گوئی سے بادشاہ ناراض ہوا اور اسکو قید کر دیا اُس کے دوستوں نے سمجھایا کہ بادشاہ کے سامنے یہ آزادی خلاف مصلحت تھی، درویش نے جواب دیا،

رسانیدن امر حق طاعت است | نہ زنداں نہ ترسم کہ یک ساعت است

کسی نے یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی، بولا کہ یہ اس کی حماقت ہے ایک ساعت نہیں، تمام عمر اس کو قید خانہ میں رہنا ہوگا، درویش نے کہا،

کہ دنیا ہمی ساعتے بیش نیست | غم و خورمی پیش درویش نیست

بادشاہ نے حکم دیا کہ اسکی زبان گدی سے کھینچ لی جائے، درویش نے کہا مجھکو اسکی بھی پروا نہیں، مجھ کو جس سے کہنا سننا ہے، وہ بولے بغیر میری بات سمجھ سکتا ہے،

من از بے زبانی ندارم غمے | کہ دانم کہ ناگفتہ داند ہمے

اس قسم کی متعدد حکایتیں نہایت پر اثر طریقہ سے لکھی ہیں جن سے اس نے اپنے تمام

ابنائے زمانہ کے خلاف لوگوں کو آزادی اور بیباکانہ حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور جب یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ کا یہ قول نہ تھا، بلکہ عمل بھی تھا اُس کی تعلیم کا دل پر نہایت قوی اثر ہوتا ہے، شیخ نے یہ بھی بتایا کہ ملک کی آمدنی میں بادشاہ کا صرف اس قدر حق ہے کہ بقدر ضرورت اس سے تمتع اٹھائے، اس سے زیادہ اس کو کوئی حق نہیں، ایک سادہ وضع بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ کسی نے اس سے کہا کہ حضور دیبائے چینی کی قبا زیب تن فرماتے تو زیادہ موزوں تھا، بادشاہ نے کہا،

نہ از بہر آں می ستانم خراج — کہ زینت کنم بر خود و تخت و تاج
مرا ہم زصد گونہ آز و ہوا است — ولیکن نہ تنہا خزینہ مراست
خزائن پُر از بہر لشکر بود — نہ از بہر آئین و زیور بود،
چو دشمن خر روستائی برد — ملک باج و دہ یک چرا می خورد

یہ خود شیخ کے خیالات ہیں لیکن بلاغت کے اصول کے لحاظ سے بادشاہ کی زبان سے ادا کیا ہے کہ بادشاہوں پر اس کا اثر زیادہ ہوگا،

احسان عام احسان کا مضمون ایشیا کا مرغوب عام مضمون ہے، اور شیخ نے اس مضمون کو اسی عام طریقہ پر لکھا ہے جو ایشیائی طبائع کا عام انداز ہے، حاتم طائی کی فیاضیوں کی چھوٹی حکایتیں بڑی آب و تاب سے لکھی ہیں اور یہ نہ سمجھے

بیا بہ ملک قناعت کہ در دسر نہ کشی — زقصہ ہا کہ بہ ہمت فروش طے بستند

یہ بھی ہدایت کی ہے کہ مستحق اور غیر مستحق کی تمیز کی کوئی ضرورت نہیں،

گرہ برسر بند احساں مزن — کہ ایں مکر و شید است و آں زرق و فن

اخیر میں بڑا دل کڑا کرکے یہ تفریق کی ہے کہ ظالموں کے ساتھ احسان نہ کرنا چاہئے،

تاہم اس باب میں بھی شیخ نے بعض نکتے اپنے زمانہ کی عام سطح سے بالاتر لکھے ہیں، مثلاً دینداروں کے نزدیک محاسنِ اخلاق جس قدر ہیں، مثلاً عفو، حلم، مروت، جود وکرم سب مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر مذہب والوں کے ساتھ عموماً "اشداء علی الکفار" کا برتاؤ کرنا چاہیئے، لیکن شیخ کے احسانِ عام کا بادل، ویرانہ وچمن دونوں پر یکساں برستا ہے،

اس نے ایک حکایت لکھی ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر کو مومن سمجھ کر مہمان کیا، جب اس کا گبر ہونا ظاہر ہوا تو دسترخوان پر سے اٹھادیا، اس پر وحی آئی کہ

منش دادہ صد سال روزی و جاں　　　ترا نفرت آمد ازو یک زماں

یعنی میں نے تو اس کو سو برس تک کھلایا پلایا، تم دم بھر بھی اس کے ساتھ بسر نہ کرسکے،

عشق عشق، شیخ کے زمانہ میں مسلمانوں کی قوتوں میں یک لخت زوال آچکا تھا، اس لئے عشق ومحبت کے سوا اور کیا کام باقی رہا تھا، شیخ نے عام مذاق کے لحاظ سے اس راگ کا چھیڑنا بھی ضروری سمجھا، اور اپنی دانست میں اس میں بھی اصلاح کی، یعنی عشق مجازی کو برا کہا، اور عشق حقیقی کے محاسن بیان کئے، لیکن سچ یہ ہے کہ اگر ایک اخلاقی کتاب سرے سے اس فتنہ انگیز مضمون سے پاک رہتی تو بہت اچھا ہوتا، ع

اہل زکام را مدہ ایں گل کہ بو کند

قناعت قناعت، تواضع، اور رضا وغیرہ کو جادو اثر طریقہ سے بیان کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین کے بار بار اعادہ کرنے سے قوم میں افسردگی، بیکاری، پست ہمتی پیدا ہوتی ہے، اس لئے یہ مضامین ہمارے اخلاقی دفتر سے چند روز کے لئے نکال دینے کے قابل ہیں،

قناعت بظاہر پست ہمتی کا دوسرا نام ہے، اور اس میں شک نہیں کہ قناعت کے جو غلط معنی عموماً علماء اور زہاد نے دلوں میں بٹھا دئے ہیں، اس نے قوم کے اپاہج بنانے میں بہت مدد دی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ نے قناعت کے جو معنی قرار دئے وہ انسان کی خود داری اور عزت نفس کا سب سے ضروری مرحلہ ہے، ایشیائی حکومتوں میں ہر قسم کے بیہودہ اخلاق مثلاً خوشامد، ذلت نفس، نفاق، ریا، زمانہ سازی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ ان باتوں کے بغیر کوئی شخص دولت اور عزت نہیں حاصل کرسکتا، اس لئے دولت و عزت کی پروانہ کرنا، ان عیوب سے بچنے کا سب سے پہلا مرحلہ ہے، شیخ اسی بنا پر قناعت کی تعلیم دیتا ہے،

قناعت کن اے نفس بر اندکے ۔۔۔ کہ سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیش سلطاں بہ خواہش روی ۔۔۔ چو یکسو نہادی طمع، خسروی
وگر خود پرستی شکم طبلہ کن ۔۔۔ درِ خانۂ این و آں قبلہ کن
قناعت سر افرازد ای مرد ہوش ۔۔۔ سر پر طمع بر نیاید ز دوش
کسے را کہ درج طمع در نوشت ۔۔۔ نباید بہ کس عبد و چاکر نوشت
کند مرد را نفسِ امّارہ خوار ۔۔۔ اگر ہوشمندی، عزیزش بدار
گر آزادۂ بر زمیں خسپ و بس ۔۔۔ مکن بہر قالی، زمیں بوس کس
چو بینی کہ از سعی بازو خورم ۔۔۔ بہ از میدہ بر خوان اہل کرم

یعنی اگر تم قناعت اختیار کروگے تو تم کو بادشاہ اور فقیر یکساں نظر آئیں گے، تم بادشاہ کے آگے کیوں سر جھکاتے ہو، طمع چھوڑ دو، تم خود بادشاہ ہو، جو شخص طمع چھوڑ دیگا وہ اپنے آپ کو غلام اور خانہ زاد نہیں لکھ سکتا، نفسِ امارہ انسان کو ذلیل

کرتا ہے، اگر تم کو عقل ہے تو تم نفس کی عزت کرو، تم کو زمین پر پڑ کر سو رہنا چاہئے، لیکن قالین کے لیے کسی کے آگے زمین نہیں چومنی چاہئے، اس سے بڑھ کر کیا شریفانہ تعلیم ہو سکتی ہے،

اس سے ظاہر ہے کہ اگر عزتِ نفس کے قائم رہنے کے ساتھ دولت و ثروت، نام و نمود، جاہ و اعزاز نہ حاصل ہو سکتا ہو تو شیخ اس سے باز رکھنے کی تعلیم نہیں دیتا،

ایک حکایت میں شیخ نے اس نکتہ کو صاف اور واضح کر دیا ہے، اور بتایا ہے کہ کسب اور جہد کو توکل پر ترجیح ہے، حکایت یہ ہے، کہ ایک شخص نے ایک لومڑی کو دیکھا جس کے ہات پاؤں کٹے ہوئے تھے، اس کو تعجب ہوا کہ یہ کھاتی پیتی کہاں سے ہے؟ اتفاق سے ایک شیر آ نکلا اس کے منہ میں شکار تھا، جب وہ کھا کر چلا گیا تو لومڑی نے اس کا بچا ہوا جھوٹا کھا لیا، یہ دیکھ کر اس شخص کو خیال ہوا کہ ہات پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں، میں بھی اسی طرح یا شکستہ بن کر بیٹھ رہوں خدا کہیں سے روزی بھیجدیگا، لیکن کئی دن گزر گئے یہ یوں ہی فاقے کیا کئے، آخر ہاتف غیب پکارا،

برو شیر غرندہ باش اے دغل　　　مینداز خود را چو روباہ شل

یعنی شیر ہو کر لومڑی کیوں بنتے ہو،

بچنگ آر و با دیگراں نوش کن　　　نہ بر فضلۂ دیگراں گوش کن

چو مرداں بہ تن رنج و راحت رساں　　　مخنث خورد دست رنج کساں

بگیر اے جواں دست درویش پیر　　　نہ خود را بیفگن کہ دستم بگیر

تربیت　تربیت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اور بہت سے نکتے ایسے لکھے ہیں، جو اس زمانہ کی سطح سے بالاتر ہیں، مثلاً قدیم تربیت میں لڑکوں کو زجر و توبیخ بلکہ جسمانی سزا دینی ایک ضروری چیز تھی، اور آج تک وہ خیال قائم ہے، خود شیخ نے ایک معلّم کی زبان سے کہا ہے

ع جور استاد بہ زمہر پدر

لیکن شیخ کی خود تعلیم یہ ہے،

نوآموز را ذکر و تحسین و زہ زتوبیخ و تہدید استاد بہ

صنعت و حرفت کی تعلیم، امرا، (ترقیف) کے بچوں کے لئے بھی لازمی قرار دی ہے، حالانکہ آج یورپ کی مثالیں دیکھکر بھی ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے،

بیاموز پروردہ را دست رنج (صنعت) دگر دست داری چو قارون بگنج

بپایاں رسد کیسۂ سیم و زر نگر دو تہی کیسۂ پیشہ ور

چہ دانی کہ گردیدن روزگار بہ غربت بگرداندش در دیار

چو بر پیشہ باشدش دسترس (زابو) کجا دست حاجت برد پیش کس

عام خیال یہ ہے کہ بچوں کو کم درجہ کی خوراک اور موٹا جھوٹا کپڑا پہنانا چاہئے تاکہ آرام طلب اور عیش پسند نہ ہو جائیں، لیکن شیخ فرماتے ہیں،

پسر را نکو دار و راحت رساں کہ چشمش نماند بہ دستِ کساں

یعنی بچے کو سر و سامان سے رکھنا چاہئے تاکہ اس میں بلند نظری پیدا ہو اور لوگوں کی طرف اس کی نگاہیں حسرت سے نہ اٹھیں،

اس زمانہ میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا، صوفیہ اور اہل نظر اسکو عشق حقیقی کی منزل اوّلین قرار دیتے تھے، اور ارباب ذوق کے لئے تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی سامان نہ تھا، شیخ چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا تھا، اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا، اس لئے اس نے نہایت سختی سے اس کی برائیاں بیان کیں.

سر از مغز و دست از درم کن تہی چو خاطر بہ فرزند مردم نہی

مکن بد بہ فرزند مردم نگاہ | کہ فرزند خویشت بر آید تباہ

صوفیہ کا پردہ کھولتے ہیں،

گروہے نشینند با خوش پسر | کہ ما پاک بازیم و اہلِ نظر
ز من پرس فرسودۂ روزگار | کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار
ازاں برگِ خرما خورد گوسفند | کہ قفل است بر تنگ خرما و بند

صوفیوں کے اس دعوی کو کہ جمال سے ہم کو صنعتِ ایزدی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح رد کرتے ہیں،

چہ اطفل یک روزہ ہوشش نہ برد | کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خرد
محقق ہماں بیند اندر ابل | کہ در خوبرویانِ چین و چگل

یعنی اگر صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو وہ ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ میں نظر آتی ہے، خوش جمال اور بدجمال کی کیا تخصیص ہے، ایک باریک بیں کو اونٹ کے ناموزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں، جو چین اور چگل کے معشوقوں میں ہیں،

شیخ حسن پرستی سے منع نہیں کرتا لیکن بتاتا ہے کہ اس کا صحیح مصرف کیا ہے،

زنِ خوب و خوشخوے آراستہ | چہ ماند بہ نادانِ نو ساختہ (امرد)
در و دم چو غنچہ دمے از وفا | کہ از خندہ افتد چو گل برقفا
خرابت کند شاہد خانہ کن | برو خانہ آباد گرداں بزن

افسوس ہے کہ عورتوں کا رتبہ شیخ کے زمانہ میں مردوں سے بہت کم سمجھا جاتا تھا اس لئے جو لوگ اپنی بیوی سے زیادہ محبت رکھتے تھے زن پرست کہلاتے تھے، اور لوگ

ان کو طعنہ دیتے تھے،

شیخ نے اگرچہ ان لوگوں کی طرف سے یہ معذرت کی ہی،

کسے را کہ بینی گرفتار زن | مکن سعدیا طعنہ بروی مزن
تو ہم جور بینی و بارش کشی | اگر یک شبے در کنارش کشی
زناں شوخ و فرماندہ و سرکش اند | ولیکن بدیدم کہ در برخوش اند

لیکن افسوس ہے کہ اس قدسی پیکر کی غرض و غایت لوگوں نے صرف نفس پرستی سمجھی، یہ نہ سمجھے کہ یہ جنس لطیف چہرۂ کائنات کا آب و رنگ ہے،

شیخ نے عورتوں کے متعلق ایک اور ہدایت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہی کہ اس زمانہ کا معیار اخلاق کس قدر پست ہو گیا تھا،

زن نو کن اے دوست ہر بہار | کہ تقویم پارینہ ناید بکار

لیکن اگر عورت بھی اس فلسفہ پر عمل کرے تو کیا جواب ہو گا؟

شیخ ہمہ تن مذہبی آدمی تھا، اس لئے اس نے تعلیم و اخلاق کی بنیاد بھی مذہب پر رکھی ہے، مذہبی غلو میں حقیقت شناسی بہت کم قائم رہتی ہے، فرض کرو ایک شہر میں ہزاروں مسجدیں ہیں اور نمازیوں کی ضرورت سے زیادہ ہیں، باوجود اس کے ایک شخص پھر نئی مسجد بنائے تو مذہبی آدمی کبھی اس کام کو عبث اور بے فائدہ نہیں کہہ سکتا، حالانکہ قرون اولیٰ میں ایسے کام سے علانیہ روک دیا جاتا تھا حضرت عمرؓ نے حکم بھیجا تھا کہ کسی شہر میں (بجز کوفہ و بصرہ کے) ایک سے زیادہ مسجد نہ بننے پائے، ولید نے جامع مسجد کی تعمیر میں شاہانہ حوصلہ مندی کی تو قوم نے علانیہ کہہ دیا کہ بیت المال کا روپیہ اس طرح ضائع نہیں کیا جا سکتا،

فرض کرو ایک شہر میں بہت سی مسجدیں موجود ہیں، لیکن انگریزی تعلیم (جو تحصیل معاش کا ذریعہ ہے) اس کا سامان بالکل نہ ہو، اب ایک شخص ایک مسجد اور دوسرا شخص انگریزی مدرسہ بنائے تو تم کس کام کو ترجیح دوگے؟

شیخ کی نکتہ سنجی پر حیرت ہوتی ہے جب نظر آتا ہے کہ وہ مذہبی جوش اور غلو کے حالت میں حقیقت شناسی سے کبھی الگ نہیں ہوتا، ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بادشاہ نے روزہ رکھا، باورچی کی بیوی نے کہا سلطان کو اس روزہ سے کیا ثواب ہوگا کہ ہم سب بھوکے مریں گے۔

که سلطان ازیں روزه گوئی چه خواست ・ که افطار او عید طفلان ماست

شیخ اس مسئلہ کو زیادہ روشن کرنے کے لئے خود اپنی زبان سے کہتا ہے،

خورنده که خیرش برآید ز دست ・ به از صائم الدهر دنیا پرست

مسلّم کسے را بود روزه داشت ・ که درمانده را دهد نان چاشت

(روزه دار)

دگرنه چه حاجت که زحمت بری ・ ز خود بازداری و هم خود خوری

خیالاتِ نادانِ خلوت نشین ・ بهم بر کند عاقبت کفر و دین

اخیر شعر میں کہتا ہے کہ سادہ دل خلوت نشیں مذہب کو خراب کر دیتا ہے،

ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش نے حج کا سفر کیا اور ہر ہر قدم پر دو دو رکعتیں نماز پڑھتا جاتا تھا، اس ریاضتِ شاقہ پر اس کو دل میں غرور پیدا ہوا، ہاتفِ غیب نے آواز دی کہ ایک دل کو خوش کرنا ہزار رکعت سے بہتر ہے،

به احسانے آسوده کردن دلے ・ به از الف رکعت بهر منزلے

ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے لیکن صوفیہ کا گروہ کثیر جو ہمہ تن ریاکار رہے ان کی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر

نہیں کرسکتا، شیخ اس راز سے خوب واقف تھا اس لئے اس نے نہایت دلیری سے اس طلسم کو توڑا، غزلوں میں نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے،

برون نمیروداز خانقه یکے ہشیار | که پیش شحنه بگوید که صوفیان مستند

محتسب درقفاے رندان است | غافل ازصوفیان شاہد باز

بوستان میں ایک شخص کی زبان سے ان لوگوں کی پوری تصویر کھینچی ہے،

که زنہار ازیں مردمانِ خموش | پلنگانِ درندهٔ صوف پوش

که چوں گربه زانو بهم برزنند | وگر صیدے افتد چو سگ درجہند

سوے مسجد آورده دکانِ شید | که درخانه کمتر تواں یافت صید

سپید و سیه پاره بردوخته | به سالوس پنهاں زر اندوخته

زہے جو فروشانِ گندم نماے | جہاں گرد سالوس وخرمن گدائے

مبیں درعبادت که پیرند وسست | که دررقص وحالت جوانند و چست

عصاے کلیم اند بسیار خوار | به ظاہر چنیں زرد روے ونزار

ز سنت نه بینی درایشاں اثر | بجز خواب پیشین و نانِ سحر

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شیخ نے اخلاق کی بنیاد بے تعصبی پر قائم کی، اس نے مختلف طریقوں سے بے تعصبی کی تعلیم دی ہے، اور جتایا ہے کہ تعصب کے ساتھ اخلاق کا لطیف اور نازک حاسہ قائم نہیں رہ سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر سے جو برتاو کیا تھا، اسکی نسبت وحی کے ذریعہ سے ان کو خدا نے تنبیہ کی کہ ہمارا یہ طریقہ نہیں، اس حکایت سے شیخ کو یہ جتانا تھا کہ معاشرت اور حسن اخلاق میں کافر و مسلم کی تمیز نہیں، شیخ عموماً ہر مذہب و ملت کے بڑے لوگوں کا نام جب لیتا ہے تو ادب

سے لیتا ہے، دارا آتش پرست تھا، تاہم شیخ کہتا ہے،

شنیدم کہ دارائے فرخ تبار | ز لشکر جدا ماند روز شکار

نوشیرواں کے زمانہ میں پیدا ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ناز کرنا ثابت کرتا ہے،

سزد گر بدورش بنازم چناں | کہ سید بہ دوران نوشیرواں

خود سنی اور پکا سنی تھا (علیٰ رغم انف قاضی نور اللہ) لیکن فردوسی کا نام (جو قطعاً شیعہ تھا) اس طرح لیتا ہے،

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد | کہ رحمت بر آں تربت پاک باد

کیا آج کوئی روشن خیال سنی عالم، کسی شیعہ کی تربت کو پاک اور اُس کی نسبت رحمت کی دعا کر سکتا ہے،

باریک نکتے

شیخ نے اگرچہ فلسفۂ اخلاق کو شاعرانہ انداز میں لکھا، لیکن مسائلِ اخلاق کے متعلق بہت سے ایسے نازک، دقیق اور لطیف دلائل اور وجوہ بیان کئے کہ اخلاق کی فلسفیانہ تصنیفات میں بھی نہیں مل سکتے، کبر، حسد، غیبت وغیرہ خباثث نفسانی کی برائیوں کے وجوہ تمام کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن شیخ ان سب سے الگ دقیق باتیں پیدا کرتا ہے، بدگوئی کی برائی کی نسبت کہتا ہے،

بد اندر حق مردم نیک و بد | مگو اے جوان مرد صاحب خرد

کہ بد مرد را خصم خود می کنی | و گر نیک مرد است بد میکنی

یعنی بدگوئی نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ جس کی بدگوئی کروگے دو صورت سے خالی نہیں اگر وہ اچھا آدمی ہے تو اچھے آدمی کو برا کہنا مناسب نہیں، اور برا ہے تو برے آدمی کو اپنا

دشمن بنا لینا اچھا نہیں، یہ ظاہر ہے کہ برا آدمی کسی کی دشمنی کرتا ہے تو جائز ناجائز کی پرواہ نہیں کرتا، اس لئے برے آدمی کو اپنا دشمن بنانا اپنے آپ کو بلا میں پھنسانا ہے، یہ تقسیم اور استدلال جس قدر فلسفیانہ ہے، اسی قدر واقعی اور عملی ہے،

یا مثلاً خاموشی کی خوبیاں تمام اخلاقی کتابوں میں مختلف طریقوں سے بیان کی ہیں، لیکن شیخ سب سے الگ فلسفیانہ طریقہ سے اس کو ثابت کرتا ہے،

ترا خامشی اے خداوند ہوش　　　وقارست و نا اہل را پردہ پوش

اگر عالمی ہیبتِ خود مبر　　　وگر جاہلی پردۂ خود مدر

یعنی خاموشی، عالم و جاہل دونوں کے لئے مفید ہے، عالم کا تو وقار بڑھتا ہے اور جاہل کا پردہ ڈھکا رہتا ہے،

یا مثلاً دوسروں کے اعتراض اور نکتہ چینی کا برا نہ ماننا اور اس کو گوارا کرنا اسکو شیخ اس طرح دلنشین کرتا ہے،

گرآنی کہ دشمنت گوید مرنج　　　درآں نیستی گو، برو باد سنج

یعنی دو حال سے خالی نہیں، یا جو اعتراض دشمن کرتا ہے، واقعی ہے تو واقعی اور سچی بات کا برا ماننا کیا؟ اور جھوٹ اور غلط کہتا ہے تو جھوٹ بات کا کیا رنج، اسکو بکنے دو،

یا مثلاً بدمزاج اور بد اخلاق زاہد کی نسبت لکھتا ہے،

نہ خورد از عبادت برآں بیخرد　　　کہ با حق نکو بود و با خلق بد

یعنی اس شخص نے عبادت کا پھل نہیں چکھا جو خدا کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا اور مخلوقات کے ساتھ برائی سے، یہاں یہ دقیق نکتہ بتایا ہے کہ کج خلق عابد جو عبادت کرتے ہیں، ان کی عبادت، اصلی نیکی اور دل کے اقتضا سے نہیں ہوتی، بلکہ سزا اور عقاب کے

ڈرسے ہوتی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس سے ان کو اس قسم کا اندیشہ نہیں (بندگانِ خدا سے) اس سے وہ کج اخلاقی اور بدمزاجی اور دل آزاری کا برتاؤ کرتے ہیں،

شیخ نہایت سرسری اور معمولی واقعات سے جو رات دن لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں، نہایت دقیق نکتے پیدا کرتا ہے، مثلاً چھوٹے بچوں کو لوگ میلے ٹھیلے میں ساتھ لیجاتے ہیں تو اس کے ہات میں دامن دیدیتے ہیں کہ ہجوم میں کہیں بھٹک نہ جائے، شیخ کو بچپن میں یہ واقعہ پیش آیا تھا،

شیخ نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا،

همے یاد دارم ز عہدِ صغر | کہ عیدے برون آمدم با پدر
ببازیچہ مشغول مردم شدم | در آشوب خلق از پدر گم شدم
بر آوردم از بیقراری خروش | پدر ناگہانم بمالید گوش
کہ اے شوخ چشم، آخرت چند بار | نگفتم کہ دستت ز دامن مدار
تو ہم طفل راہی بہ سعی اے فقیر | برو دامنِ نیک مرداں بگیر

یعنی جو شخص، راہ سلوک کی ابتدائی منزلوں میں ہو وہ بچہ ہے، اسلئے اس کو مرشد کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے،

تم نے دیکھا ہوگا کہ بلی اپنے فضلہ کو خاک میں چھپا دیتی ہے تم کو کچھ خیال بھی نہ آیا ہوگا لیکن شیخ اس مبتذل واقعہ سے کس قدر پر اثر اخلاقی نتیجہ استنباط کرتا ہے،

پلیدی کند گربہ بر جائے خاک | چو زشتش نماید بپوشد بہ خاک
تو آزادی از ناپسندیدہ ہا | نہ ترسی کہ بر وے فتد دیدہ ہا

یعنی بلی کو اتنا خیال ہے کہ وہ اپنے فضلہ کو جو بدنما معلوم ہوتا ہے، چھپا دیتی ہے، تم

ہزاروں برائیاں کرتے ہو اور لوگ دیکھتے ہیں اور تم کو شرم نہیں آتی،

ایک شخص کیچڑ میں لتھڑا ہوا مسجد میں جانے لگا، موذن نے ڈانٹا کہ نجاست کے ساتھ ایسی پاک جگہ میں جاتا ہے، شیخ پر اس کا اثر جو ہوا وہ یہ تھا۔

زبخت نگوں طالع اندیشگفت | گل آلودۂ راہ مسجد گرفت
مرو دامن آلودہ در جای پاک | یکے زجر کردش کہ تبت یداک
کہ پاک است و خرم بہشت برین | مرا رقتے در دل آمد برین
بگل آلودۂ معصیت را چہ کار | دراں جای پاکان امیدوار

بچپن میں شیخ کے والد نے شیخ کو انگوٹھی خرید کر دی ہی کسی عیار نے مٹھائی کا لالچ دیا، ان کو انگوٹھی کی کیا قدر تھی، مٹھائی لے کر انگوٹھی دیدی، یہ واقعے عموماً پیش آتے ہیں، شیخ اس سے کس قدر عظیم الشان نتیجہ پیدا کرتا ہی،

بہ شیرینی از دستم انگشتری | بدر کرد ناگہ یکے مشتری
بہ شیرینی از وے توانند برد | چو نشناسد انگشتری طفل خرد
کہ در عیش شیرینی بر انداختی | تو ہم قیمت عمر نشناختی

لطف و احسان کا اثر ایک معمولی واقعہ سے اس طرح ثابت کرتے ہیں،

بہ تگ در پیش گوسفندے دواں | بہ رہ بر یکے پیشم آمد جواں
کہ می آید اندر پیت گوسفند | بد و گفتم ایں ریسمان است و بند
چپ و راست پوئیدن آغاز کرد | سبک طوق و زنجیر از و باز کرد
مرا دید و گفت اے خداوند رائے | چو باز آمد از عیش و شادی بجائے
کہ احسان کمندیست در گردنش | نہ ایں ریسماں می برد با منش

ایک درویش کو کتے نے پاؤں میں کاٹ لیا، زخم کی تکلیف سے رات بھر وہ کراہا کیا، اس کے ایک کمسن لڑکی تھی، اُس نے کہا ابا! پھر آپ نے کیوں نہیں کتے کو کاٹا کہ برابر سرابر ہو جاتے، درویش نے کہ جانِ من! میرے دانت کتے کے قابل نہ تھے، شیخ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے، کہ تم کو اگر کوئی نااہل بُرا کہے اور تم بھی اُس کو بُرا کہو تو اسکی یہی مثال ہو گی کہ آدمی کتے کو کاٹنا چاہے،

محال است اگر تیغ بر سر خورم — کہ دندان بپائے سگ اندر برم
توان کرد با ناکساں بدرگی — ولیکن نیاید ز مردم سگی

شیخ کی انتہائے قوت تخیل کا اندازہ، ان فرضی حکایتوں سے ہو سکتا ہے جو محض اسکی قوت تخیل کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جن کو وہ واقعیت اور حسنِ استدلال کا مجموعہ بنا دیتا ہے مثلاً

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم — گر او ہست، حقا کہ من نیستم
چو خود را بہ چشم حقارت بدید — صدف در کنارش بجاں پرورید
سپہرش بہ جائے رسانید کار — کہ شد نامور لولوے شاہوار

یعنی بادل سے ایک قطرہ ٹپکا، دریا کا پاٹ دیکھ کر شرمایا کہ اس کے آگے میری کیا حقیقت ہے، چونکہ اُس نے اپنے آپ کو حقیر سمجھا، سیپ نے اس کو اپنی گود میں لیا، چند روز کے بعد دیکھا تو وہی قطرہ گوہر شاہوار تھا، یا مثلاً

گلے خوشبوے در حمام روزے — فتاد از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوی دل آویز تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — دگر نہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یا مثلاً

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک — بگوش آمدم نالۂ دردناک

کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر — کہ چشم و بنا گوش و روی ست و سر

یعنی میں نے ایک دن ایک خاک کے ٹیلہ پر پھاوڑا مارا، اس سے آواز آئی کہ میاں اگر تم میں آدمیت اور غیرت ہے تو ذرا آہستہ، کیونکہ یہ سب آنکھیں اور کان اور چہرے اور سر ہیں،

(یعنی آج جو خاک ہے یہ پہلے انسان کی اعضا تھے جو بوسیدہ ہو کر خاک ہوگئے)

یا مثلاً

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ — بتابد بہ شب کرمکے چوں چراغ

یکے گفتش اے مرغکِ شب فروز — چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

بہ بیں کاتشیں کرمکِ خاک زاد — جواب از سر روشنائی چہ داد

کہ من روز و شب جز بہ صحرا نیم — ولے پیش خورشید پیدا نیم

یا مثلاً

شبے یاد دارم کہ چشمم نہ خفت — شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت

کہ من عاشقم گر بسوزم رواست — ترا گریہ و سوز بارے چراست

بگفت اے ہوا دار مسکین من — برفت از برم یار شیرین من

تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام — من استادہ‌ام تا بسوزم تمام

ترا آتشِ عشق اگر پر بسوخت — مرا بیں کہ از پائے تا سر بسوخت

پیرایۂ ادا — شیخ کی کمال شاعری کا اصلی معیار، اس کا پیرایۂ ادا ہے، اس سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا، کہ کس مضمون کے مؤثر کرنے کا سب سے بڑھکر کونسا

طریقہ ہے، جن جن مضامین کو اس نے لیا ہے، ان کو جس پیرایہ میں ادا کیا ہے، متقدمین اور متاخرین میں اس کی نظیر مطلق نہیں مل سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اخلاق میں سیکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، صرف ایک مخزن الاسرار نظامی کے طرز پر ۶۰ مثنویاں لکھی گئیں، اور سب کی سب اخلاق و تصوف میں ہیں، لیکن بوستان اور گلستان کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا، چند مثالوں سے تم اس کا اندازہ کر سکتے ہو،

مثلاً دولت و حکومت کی تنقیص ایک پامال مضمون ہے، جو سیکڑوں دفعہ لوگ مختلف پیرایوں میں ادا کر چکے ہیں، لیکن شیخ کا صرف ایک شعر سب پر بھاری ہے،

گدارا کند یک درم سیم سیر　　فریدوں بہ ملک عجم نیم سیر

شیخ نے اس کے ساتھ فلسفیانہ طریقہ سے ثابت کر دیا ہے کہ دولت مندی در حقیقت محتاجی ہے،

خبردہ بہ درویش سلطاں پرست　　کہ سلطان ز درویش مسکیں ترست

نگہبانی ملک و دولت بلاست　　گدا بادشاہ است و نامش گداست

بخسپند خوش، روستائی و جفت　　بہ ذوقے کہ سلطان در ایوں نہ خفت
دہقان　بیوی

اسی مضمون کو ایک مصرع میں ادا کیا ہے، ع

آنانکہ غنی تراند محتاج تراند

یہ ظاہر ہے کہ انسان جس قدر دولت مند اور امیر ہو جاتا ہے، اس کی ضرورتیں اور حاجتیں بڑھتی جاتی ہیں، اس لئے زیادہ دولت مندی در حقیقت زیادہ محتاجی ہے، یا مثلاً یہ تلقین کرنا تھا کہ دولت مندوں کو غریبوں پر رحم کرنا چاہئے، اسکو شیخ نے اس حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا،

ملک صالح از بادشاہانِ شام | بروں آمدے صبحدم با غلام
بگشتے در اطراف بازار و کوی | بہ رسمِ عرب نیمہ بربستہ روی
دو درویش در مسجدے خفتہ یافت | پریشاں دل و خاطر آشفتہ یافت
یکے زاں دو می گفت با دیگرے | کہ ہم روز محشر بود داورے
گر ایں بادشاہانِ گردن فراز | کہ با لہو و عیش اند و با کام و ناز
درآیند با عاجزاں در بہشت | من از گور سر برنگیرم ز خشت
بہشت بریں ملک ماوی ماست | کہ بند غم امروز بر پای ماست
اگر صالح آں جا بہ دیوار باغ | درآید، بہ کفشش بدرّم دماغ

حکایت کا ماحصل یہ ہے کہ ملک صالح (شام کا بادشاہ اور سلطان صلاح الدین کے خاندان سے تھا) ایک دن شہر کے گشت کو نکلا، دو فقیر ایک مسجد میں لیٹے تھے، اور جاڑے اور بھوک کی تکلیف سے بیتاب تھے، ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ آخر قیامت میں بھی کوئی حاکم ہوگا، اگر یہ بادشاہ لوگ جو دنیا میں مزے اڑاتے پھرتے ہیں، ہم غریبوں کے ساتھ بہشت میں داخل ہونگے تو میں قبر سے سر نہ اٹھاؤں گا، بہشت ہمارا حصہ ہے کہ ہم آج مصیبتیں بھر رہے ہیں، صالح اگر وہاں بہشت کی دیوار کے پاس بھی آیا تو اس کا سر توڑ دونگا،

دولت مندوں کو غریبوں پر رحم دلانے کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ تکلیف کی حالت میں غریبوں کو امیروں کی ناز و نعمت پر جو رشک، جلن، اور غصہ پیدا ہوتا ہے، اسکو دکھایا جائے، شیخ نے اس کی نہایت صحیح تصویر کھینچی ہے، شعر باوجود اس کے کہ تہذیب کی حد سے بڑھا ہوا ہے، واقعیت اور اصلیت کی اصلی تصویر ہے، لیکن شیخ نے اسی پر

اکتفا نہیں کی، بلکہ بادشاہ کے فیاضانہ طرز عمل کو بھی دکھایا،

روان ہر دو کس را فرستاد و خواند ... بہ ہیبت نشست و بہ حرمت نشاند
بر ایشان ببارید باران جود ... فرو شست شان گرد ذلّ از وجود
شہنشہ ز شادی چو گل بر شگفت ... بخندید و در روی درویش گفت
من آن کس نیم کز غرور حشم ... ز بیچارگان روی در ہم کشم
من امروز کردم، در صلح باز ... تو فردا مکن، در بروئیم فراز

یعنی بادشاہ نے اُن فقیروں کی مہمانی اور حاجت روائی کرکے کہا کہ آج میں آپ لوگوں کے ساتھ عاجزی اور دوستی کا برتاؤ کرتا ہوں، آپ بھی میرے ساتھ قیامت میں مہربانی کیجئے گا، اور مجھ کو بہشت میں آنے سے نہ روکئے گا،

سننے والے پر فقیروں کے غم اور غصہ سے جو اثر پیدا ہوا تھا، وہ بادشاہ کے شریفانہ طرز عمل اور حکیمانہ جواب سے کس قدر اور زیادہ قوی ہوگیا ممکن نہیں کہ ایک دردمند دل اس کو پڑھے اور اس کے آنسو نکل نہ آئیں،

یا مثلاً غیبت کی بُرائی کو، لوگوں نے مختلف پیرایوں میں ادا کیا تھا، شیخ نے سب سے زیادہ اچھوتے لیکن نہایت موثر طریقہ سے اس حکایت کے پیرایہ میں اس مضمون کو ادا کیا،

طریقت شناسان ثابت قدم ... بہ خلوت نشستند چندے بہم
یکے زاں میان غیبت آغاز کرد ... در ذکر بیچارہ باز کرد
کسے گفتش اے یار شوریدہ رنگ ... تو ہرگز غزا کردۂ در فرنگ
بگفتا از پس چار دیوار خویش ... ہمہ عمر ننہادہ ام پاے پیش

چنیں گفت درویشِ صادق نفس | ندیدم چنیں بخت برگشتہ کس
کہ کافر زپیکارش ایمن نشست | مسلماں زجور زبانش نہ رست

یعنی چند آدمی ایک صحبت میں شریک تھے، ایک شخص نے کسی کی غیبت شروع کی، ایک نیک نفس نے کہا کیوں یار! کبھی تم نے کافروں سے لڑائی بھی کی ہے، اس نے کہا میں نے تو کبھی گھر سے قدم بھی باہر نہیں نکالا، نیک نفس نے کہا سبحان اللہ! کافر تو آپ کے حملہ سے محفوظ رہا، لیکن مسلمان آپ کی تیغِ زبان سے نہ بچ سکا، ایک اور طریقہ سے اسی مضمون کو ادا کیا ہے،

زباں کرد شخصے زغیبت دراز | بدو گفت دانندۂ سرفراز
کہ یادِ کساں، پیشِ من بد مکن | مرا بدگماں در حقِ خود مکن

زیادہ گوئی کی بُرائی نہایت پامال مضمون ہے، شیخ اس مضمون کو کس قدر عجیب اسلوب سے ادا کرتا ہے،

کمال است در نفسِ انساں سخن | تو خود را بہ گفتار ناقص مکن

یعنی قوت ناطقہ ہی انسان کا سب سے بڑا کمال ہے، ایسا نہ کرو کہ یہی وصف (زیادہ گوئی کی وجہ سے) تمہارے نقصان کا سبب قرار پائے،

کم آواز ہرگز نہ بینی خجل | جوی مشک بہتر کہ یک تودہ گل
حذر کن زنادان دہ مردہ گوی (لغو) | چو دانا یکے گوی و پروردہ گوی (معقول)
صد انداختی تیر و ہر صد خطاست | اگر ہوشمندی یک انداز و راست

یعنی سیکڑوں تیر تم نے نشانہ پر لگائے اور سب خالی گئے، اگر عقلمند ہو تو ایک تیر لگاؤ لیکن ٹھیک نشانہ پر لگاؤ،

مناجات، تضرع، استغفار اور توبہ فی نفسہ ایک موثر مضمون ہے، لیکن شیخ نے اسکو ایک حکایت کے پیرایہ میں کس قدر اور زیادہ موثر کر دیا ہے،

شنیدم کہ مستے ز تاب نبید (نشہ شراب) — بہ مقصورۂ عابدے بر دوید
بنالید بر آستانِ کرم — کہ یارب بہ فردوسِ اعلیٰ برم
موذن گریباں گرفتش کہ ہین — سگ و مسجد اے فارغ از عقل و دیں
چہ شایستہ کردی کہ خواہی بہشت — نمی زیبدت ناز با روی زشت
بگفت این سخن پیر و بگریست مست — کہ مستم بدار از من اے خواجہ دست
عجب داری از لطفِ پروردگار — کہ باشد گنہگارے اُمیدوار
ترا می نگویم کہ عذرم پذیر — در توبہ باز است و حق دستگیر
ہمی شرم دارم ز لطفِ کریم — کہ خواہم گنہ پیشِ عفوش عظیم

یعنی ایک مست نشہ کے زور میں مسجد میں گھس گیا اور رو کر پکارا کہ اے خدا مجھ کو بہشت میں لیجانا، موذن نے اس کا گریبان پکڑ کہا کہ او سگ نجس! مسجد میں تیرا کیا کام تونے کون سا اچھا عمل کیا ہے کہ بہشت کا دعوی ہے، مست رو پڑا، اور بولا کہ کیا آپ کو خدا کے لطفِ عمیم سے یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اس کی مغفرت کا امیدوار ہو، میں نے آپ سے تو مغفرت کی خواہش نہیں کی، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اور خدا دستگیر ہے، مجھ کو تو شرم آتی ہے کہ میں خدا کے عفو کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں،

غور کرو شیخ نے اس مضمون کے موثر کرنے کے لئے بلاغت کے کن نکتوں کو ملحوظ رکھا ہے، سب سے پہلے یہ کہ مناجات میں براہ راست خدا کو مخاطب نہیں کیا، کیونکہ انسان کسی شخص کو جب مخاطب کر کے اس کی مدح، یا اس کی نسبت حسن ظن ظاہر کرتا ہے تو اس

میں ظاہر داری اور خوشامد کے شائبہ کا احتمال ہوتا ہے، یہی نکتہ ہے کہ سورۂ الحمد میں خدا کی حمد، صیغۂ غائب سے ادا کی ہے، موذن کی ڈانٹ بتانے سے، مناجات مانگنے والے کی نسبت دل میں رحم کا اثر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اس سے اسکی نہایت مظلومی اور موذن کی بے رحمی ظاہر ہوتی ہے، اب اس کا یہ جواب کہ میں آپ سے تو رحم کا خواستگار نہیں مجھ کو جس سے امید ہے، وہ اور ہی کریم النفس ذات ہے، مناجات کے قبول کے لئے کس قدر موثر ہے، یہ قاعدہ ہے، کہ کوئی شخص اگر کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی مہربانی اور رحم پر اپنا بھروسہ ظاہر کرے تو اس شخص کو خواہ مخواہ اس کی شرم اور اس کا پاس ہوگا، ان باتوں کی مجموعی ترتیب نے مناجات اور طلبِ مغفرت کے مضمون کو نہایت موثر کر دیا ہے،

ہم نے اطناب کے ڈر سے صرف چند مثالوں پر قناعت کی، عموماً جن مضامین کو شیخ نے ادا کیا ہے، ان کا مقابلہ اور شعرا اور مصنفین سے کرو تو صاف نظر آئیگا کہ شیخ کو اس خصوصیت میں کیا ترجیح حاصل ہے،

مناظر قدرت اس قسم کے مضامین میں بہار کا مضمون سب سے زیادہ پامال ہے، اور اب تک پامال ہوتا آتا ہے، لیکن شیخ کے قصیدہ کا اب تک جواب نہ ہو سکا،

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار — خوش بود دامنِ صحرا و تماشائے بہار
(یعنی دن اور رات برابر ہو گئے،)
آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب — سرو در باغ برقص آمدہ و بید و چنار
باش تا غنچۂ سیراب دہن باز کند — بامداداں چو سر نافۂ آہوے تتار
باد گیسوے عروسانِ چمن شانہ کند — بوے نسرین و قرنفل برود در اقطار
ژالہ (شبنم) بر لالہ فرود آمدہ ہنگام سحر — راست چون عارضِ گلبوی عرق کردۂ یار
ارغوان ریختہ بر درگہ خضراے چمن — ہم چنان است کہ بر تختۂ دیبا، دینار

این ہنوز اول آثار جہان افروزیست	باش تا خیمہ زند دولت نیسان و ایار (بہار کے مہینے ہیں)
شاخہا دختر دوشیزۂ باغ اند ہنوز	باش تا حاملہ گردند بہ الوان ثمار (رنگ برنگ کے پھل)
تا نہ تاریک شود سایۂ انبوہ درخت	زیر ہر برگ چراغے بنہند از گل نار
سیب را ہر طرفے دادہ طبیعت رنگے	ہم بداں گونہ کہ گلگونہ کند روئے نگار
گو نظر باز کن و خلقت نارنج ببیں	ایکہ باور نہ کنی فی الشجر الاخضر نار
آب در پای ترنج و بہ و بادام رواں	ہم چو در زیر درختان بہشتی انہار

غزل یہ عموماً مسلم ہے کہ شیخ غزل کے ابو الآباء ہیں، قدماء تو سرے سے غزل کہتے ہی نہ تھے قصائد کے ابتدا میں عرب کے طرز پر جو تشبیب کہتے تھے، یہی اُس زمانہ کی غزل تھی، متاخرین قدما، مثلاً انوری، ظہیر وغیرہ نے قصیدہ سے الگ کرکے غزلیں لکھیں لیکن ان میں کسی قسم کا اثر، اور کسی قسم کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی نہ تھی، البتہ چونکہ زمانہ کے امتداد سے قدرتی طور پر زبان خود روز بروز سادہ اور صاف ہوتی جاتی تھی، اس لئے غزل کی صفائی اور سادگی بھی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی، کمال اسمٰعیل کی غزل کا نمونہ اوپر گذر چکا، اس زمانہ کے اور شعراء کی سادگی کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوگا،

غزل (از محمد بن نصیر)

گل کہ شایاں بادہ بود، رسید	آمدن وعدہ دادہ بود رسید
جنگ لالہ گذشت و لشکر گل	گرچہ پستر فتادہ بود رسید
سرو آزاد، بہر سوسن راست	منتظر، ایستادہ بود رسید
لالہ رفت، ارچہ پائے در گل بود	گل اگرچہ پیادہ بود رسید

دیگر (از صفی)

چہ در دست ایں کہ عشقش نام کردند | وزو آشوب، خاص و عام کردند

ہر آنچہ اندر زمانہ درد و دل بود | یکے کردند و عشقش، نام کردند

خراباتے است اندر عشق کاں جا | ز خونِ دل، مے اندر جام کردند

بیک ساغر دراں بت خانہ مارا | چنیں سرمست و بے آرام کردند

دیگر

فتنہ ہا بر دلم انبار مکن، گو نہ کنم | بارہا کردۂ اینکار مکن، گو نہ کنم

شیخ کو سادگی اور صفائی کے متعلق کچھ کوشش نہیں کرنی پڑی جو زبان اُن کے زمانہ میں موجود تھی پہلے ہی منجھ چکی تھی، شیخ نے جو باتیں غزل میں پیدا کیں حسب ذیل ہیں،

(۱) شیخ کے زمانہ سے پہلے جو شعرا گذرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے، ان میں سے بعضوں نے تو سرے سے عشق کو ہات بھی نہیں لگایا تھا، بعضوں نے حسن سخن کے لئے اس سے کام لیا، لیکن وہ نرے الفاظ ہی الفاظ تھے، اندر کچھ نہ تھا، شیخ کے زمانہ میں قوم کے شجاعانہ جذبات فنا ہو چکے تھے، اس لئے زندگی کا جو کچھ سہارا رہ گیا تھا یہی عشق و عاشقی تھی، حسن اتفاق سے شیخ میں یہ جذبہ فطری تھا اور چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم کے دنیوی تعلقات سے آزاد رہا اس لئے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مستقل رہی، اسی آگ کے شعلے ہیں جو اسکی زبان سے نکلتے ہیں، اُس نے معشوقوں کے جور و ستم اور بے مہری اور بیوفائی کے، جاں گداز صدمے اٹھائے ہیں، اس لئے اس کا سینہ، درد اور سوز و گداز کا آتشکدہ ہے، اشعار ذیل سے اس کا اندازہ کرو،

خبر ما برسانید بہ مرغانِ چمن | کہ ہم آواز شما در قفسے افتادہ است

گر دلے داری بہ دلدارے سپار | ضائع آں کشور کہ سلطانیش نیست

تا جرائے عقل پرسیدم ز عشق — گفت معزول است و فرمانش نیست

گفتم کہ عشق را بہ صبوری دوا کنم — ہر روز عشق بیشتر و صبر کمتر است

بہ خشم رفتۂ ما را کہ می برد پیغام؟ — بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

ہمہ از دستِ غیر نالہ کنند — سعدی از دستِ خویشتن فریاد

در سوختہ پنہاں نتواں داشتن آتش — ما ہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد

گفتمش سیر بہ بینم مگر از دل برود — آں چناں جائے گرفتست کہ مشکل برود

ولے از سنگ بباید بر سرِ راہ وداع — کہ تحمل کند آن لحظہ کہ محمل برود

ندامت ز کجا آں سپر بدست آری — کہ تیر آہ مرا ز آسمان بگردانی

حدیث عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر — بہ سر نہ کوفتہ باشد در سرائے را

سعدیا! ایں ہمہ فریاد تو بے چیزے نیست — آتشے ہست کہ دود از سر آں مے آید

سعدیا! نوبتی امشب دہلِ صبح نہ کوفت — یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

دو دوست قدر شناسند روز صحبت را — کہ مدتے ببریدند و باز پیوستند [illegible]

اَیکہ گفتی مرو اندر پے خونخوارۂ خویش — با کسے گوی کہ در دست عنانے دارد

۲۔ شیخ سے پہلے عشق کے واردات اور معاملات نہیں بیان کرتے تھے، شیخ پہلا شخص ہے جس نے اس کی ابتدا کی، خسرو، شرف جہاں قزوینی نے اسکو ترقی دی اور وحشی یزدی پر اس طرز کا خاتمہ ہو گیا،

بوسۂ از لب جاں بخش بدہ یا لبتاں — کایں متاعی است کہ بخشند و بہا نیز کنند

امشب مگر بہ وقت نمی خواند ایں خروس — عشاق بس نہ کردہ ہنوز از کنار و بوس (شب وصل)

تا نشنوی ز مسجد آدینہ بانگِ صبح — یا از درِ سرائے اتابک غریو کوس

لب از لبِ چو چشم خروس ابلہی بود برداشتن بہ گفتن بیہودۂ خروس

مرا راحت از زندگی دوش بود کہ آں ماہ رویم در آغوش بود
ندانستم از غایتِ لطف و حسن کہ سیم و سمن یا بر و دوش بود
بہ دیدار و گفتار جاں پرورش سراپاے من دیدہ و گوش بود
مؤذن غلط گفت بانگ نماز مگر ہمچو من مست و مدہوش بود
اذان

سرمست بتے لطیف و سادہ در دست گرفتہ جامِ بادہ
در مجلس بزم بادہ نوشاں بستہ کمر و قبا کشادہ
لعلش چو عقیق گوہر آگیں زلفش چو کمند، تاب دادہ
بنشستہ زمیں بہ حضرت شے گردونش بہ خدمت ایستادہ

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست تا ندانند حریفاں کہ تو منظورِ منی

۳۔ شیخ کی غزلوں کے حسن قبول کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جو خیالات ادا کرتا ہے عموماً وہ ہوتے ہیں جو عموماً عشاق اور ہوس پیشہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اس بنا پر جب اس مذاق کے لوگ، ان اشعار کو سنتے ہیں تو ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی شخص ان ہی کے خیالات کی سفارت کر رہا ہے، اور ایسے دلنشین اور موثر طریقہ سے کر رہا ہے کہ وہ خود نہیں کر سکتے تھے، مثلاً عشق پر ملامت کرنے کے وقت عاشق کے دل میں عموماً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی بدعت نہیں ہمیشہ لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں، اور اچھی صورت کی طرف دل کا نہ کھنچنا ہو بھی تو نہیں ہو سکتا، شیخ اسی خیال کو نہایت برجستگی اور صفائی سے ادا کرتا ہے،

عشق بازی نہ من آخر بہ جہاں آوردم یا گناہیست کہ اول منِ مسکیں کردم

گر کند میل بہ خوباں دلِ من خردہ مگیر | کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند
رفیق و مہربان و یار ہمدم | ہمہ کس دوست می دارند و من ہم
نظر بر نیکوان رسمے است مشہور | نہ ایں بدعت من آوردم بہ عالم
تو گر دعویٰ کنی پرہیزگاری | مصدق دارمت واللہ اعلم
وگر گوئی کہ میل خاطرم نیست | من ایں دعویٰ نمی دارم مسلّم
حدیثِ عشق اگر گوئی گناہ است | گناہ اول ز حوّا بود و آدم
دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اس شعر کی بلاغت پر لحاظ کرو، کہنا یہ تھا کہ لوگ مجھکو عاشقی سے منع کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ معشوق کا حسن ہی ایسا دلفریب ہے کہ دل قابو میں نہیں رہ سکتا، اس بات کو کہ معشوق کا حسن نظر فریب ہے، یوں ادا کیا کہ یہ معشوق سے پوچھنا چاہئے کہ وہ اس قدر حسین کیوں ہے؟ اس طرز ادا میں پھر یہ جدت کہ خود معشوق کو مخاطب بنایا، اور یہ کہا کہ یہ تو تجھ سے پوچھنا چاہئے، کہ تو اس قدر حسین کیوں ہے؟ معشوق کے حسن کی تعریف خود اس کے منھ پر، اس کا پہلو اس سے بڑھ کر کیا لطیف اور دلآویز ہو سکتا ہے،

۴- شیخ پہلا شخص ہے جس نے غزل میں، زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ریاکاری کی دقیق اور باریک کارسازیوں کی قلعی کھولی ہے، خیام نے رباعیوں میں اس مضمون کو ادا کیا تھا لیکن صاف صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں شیخ کی طرح چھپی اور چبھتی ہوئی چوٹیں نہ تھیں جن سے ریاکاروں کے دل برما جائیں،

محتسب در قفائے رندان ست | غافل از صوفیانِ شاہد باز

یعنی محتسب رندوں کا تعاقب کرتا پھرتا ہے، لیکن شاہد باز صوفیوں کی اس کو خبر تک نہیں کہ یہ چھپ چھپ کر کیا کرتے ہیں،

بروں نمی رود از خانقہ یکے ہشیار ۔۔۔ کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند

گر کند میل بہ خوباں دل من خردہ مگیر ۔۔۔ کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اس مضمون کو خواجہ حافظ نے اس قدر پھیلایا کہ خاص ان کا ہو گیا، لیکن اصل بنیاد شیخ نے قائم کی،

اے محتسب از جواں چہ پرسی ۔۔۔ من توبہ نمے کنم کہ پیرم

اس شعر میں اوروں کے بجائے خود اپنے آپ کو ملزم قرار دیا ہے، اور یہ بلاغت کا خاص پہلو ہے،

ہیچ کس بے دامنِ تر نیست اما دیگراں ۔۔۔ بازی پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

۵۔ مدح، ذم، رزم، مرثیہ، غرض جس قدر انواع مضامین ہیں، اگرچہ ان پر ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار مل سکتے ہیں، لیکن اساس مضامین چند ہی ہوتے ہیں، ان ہی کو سو طرح الٹ پلٹ کر بیان کرتے ہیں، اس لئے اصلی شاعری کا حقدار وہی ہے، جس نے یہ بنیادیں قائم کی ہوں، شیخ کے بعد اگرچہ غزل کو بہت ترقی ہوئی اور خواجہ حافظ نے اس عمارت کو اس قدر بلند کر دیا کہ طائر خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، لیکن غور سے دیکھو تو اکثر مضامین اور طرز خیال کی داغ بیل شیخ نے ڈالی تھی، مثلاً

حافظ	سعدی
بنال بلبل، اگر با منت سر یاری است	اے بلبل اگر نالی، من با تو ہم آوازم
کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است	تو عشق گلے داری من عشقِ گل اندامے

حافظ	سعدی
من از بیگانگاں ہرگز ننالم کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد	فریاد دوستاں ہمہ از دستِ دشمن است فریاد سعدی از دلِ نا مہربانِ دوست
من ارچہ عاشقم و رند و می کش و قلاش ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہ اند	گر کند میل بہ خوباں دلِ من خردہ مگیر کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

خواجہ حافظ نے نہایت لطیف طریقہ سے اس مضمون کو ادا کیا ہے، لیکن اصل خیال کی بنیاد وہی شیخ کا شعر ہے،

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من پیادہ میروم و ہمرہاں سوار انند	اے قافلہ سالار چنیں تند چہ رانی آہستہ کہ در کوہ دگر باز پیاانند
ہمہ جا جلوۂ یار است چہ مسجد چہ کنشت	سجدہ کایزد را بود، گو سجدہ در میخانہ باش
چہ عذر از بختِ خود جویم کہ آں عیار شہر آشوب بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد	اے گنج نوشدارو بر خستگاں گذر کن مرہم بدستِ و مارا مجروح می گذاری

حافظ	سعدی
دو یار زیرک و از بادۂ کہن دو منے فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے	شبے و جمعے و گویندۂ و زیبائے ندارم از ہمہ عالم جز ایں تمنائے
من ایں مقام بدنیا و آخرت ندہم اگر چہ در پیم افتند خلق انجمنے	اے برادر ما بہ گرداب اندریم واں کہ شنعت می زند بر ساحل است

طعنہ

وے از سنگ بباید بسر راہ وداع
کہ تحمل کند آں لحظہ کہ محمل برود

"

گر تو خواہی کہ بجوئی دلم، امروز بجوے
ورنہ بسیار بجوئی و بنابی باز م

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

قی

قی آں صبر و تحمل کہ با و می نازی
می نمایم بتو چوں یک دو سہ منزل برود

یہ شعر گویا واسوخت کی بنیاد ہے،

۶- شیخ سے پہلے غزل میں جو مضامین ادا کئے جاتے تھے صاف صاف سرسری طور پر ادا کر دیتے تھے، شیخ نے طرز ادا میں بہت سی جدتیں کیں اور بیان کے نئے نئے اسلوب پیدا کئے، وہ ایک معمولی سی بات کو لیتے ہیں اور طرز ادا سے اس میں اعجوبگی پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً ان کو کہنا یہ تھا کہ گناہ سب کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ اور لوگ پردہ میں کرتے ہیں، اور ہم ریاکاری سے چھپاتے نہیں، اس مضمون کو شیخ اس طرح ادا کرتا ہے،

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں ۔۔۔ باز می پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم

دامن تر گناہ کو کہتے ہیں، بر آفتاب افگندن، دھوپ میں ڈالنا، اور کسی کام کے علانیہ کرنے کو بھی کہتے ہیں، شعر کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کون نہیں کرتا، فرق یہ ہے کہ اور لوگ چھپاتے ہیں، اور ہم علانیہ کرتے ہیں، دامن تر اور "بر آفتاب افگندن" کے محاورہ اور اس طرز ادا نے کس قدر خوبی پیدا کر دی ہے، دھوپ میں ڈال دینے سے چیز خشک ہو جاتی ہے، اسلئے یہ بھی کنایہ ہے کہ ریاکاری سے بچنا کسی نہ کسی دن ہمکو گناہ سے مجتنب بھی کردیگا، یا یہ کہ خدا ایسا گناہ معاف بھی کردیگا، لیکن ریاکاری کا گناہ نہ چھوٹ سکتا ہے نہ معافی کے قابل ہے،

کشتہ مبینم و قاتل نشناسند کہ کیست　　کیں خدنگ از نظر خلق نہاں می آید

خواستم تا نظرے افگنم و باز آیم　　گفت از یں کوچہ ما راہ بدر می نرود

جمال در نظر و شوق ہمچناں باقی　　گدا اگر ہمہ عالم بہ او دہند گدا است

بعض جگہ معمولی واقعات اور حالات کو اس پیرایہ میں دکھاتے ہیں کہ نہایت عجیب ہو جاتا ہے مثلاً معشوق کی بیوفائی کو جو ایک عام بات ہے، اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں

فریاد دوستان ہمہ از دست دشمن است　　فریاد سعدی از دل نامہربان دوست

یعنی اور لوگ تو دشمن کے ہاتھ سے نالاں ہوتے ہیں سعدی کی بدقسمتی دیکھو کہ اسکو دوست اور معشوق کے ہاتھ سے فریاد کرنی پڑتی ہے، یا مثلاً یہ شعر،

ہر کس از دست غیر نالہ کند　　سعدی از دست خویشتن فریاد

ہر شخص اپنے کئے کو بھگتتا ہے اور یہ ایک معمولی بات ہو، شیخ نے اسی بات کو طرز ادا سے ایک اعجوبہ بنا دیا یعنی اور لوگ تو غیروں سے فریاد کرتے ہیں، سعدی خود اپنے آپ سے فریاد کرتا ہے، یا مثلاً یہ شعر

مبارزان جہاں، قلب دشمناں شکنند　　ترا چہ شد کہ ہمہ قلب دوستاں شکنی

بعض جگہ ایک دعوی کرتے ہیں، جو نہایت مستبعد ہوتا ہے پھر اس کو شاعرانہ توجیہ سے معمولی واقعہ ثابت کر دیتے ہیں، مثلاً

یادت نمی کنم ہمہ عمر زاں کہ یاد　　آں کس کند کہ دلبرش از یاد می رود

پہلے مصرع میں دعوی کیا کہ میں کبھی معشوق کو یاد نہیں کرتا، یہ امر عاشقی کے منصب سے نہایت مستبعد تھا، اس کو اس طرح ثابت کیا کہ یاد وہ کرے جو کبھی بھولتا بھی ہو، میں کبھی بھولتا ہی نہیں تو یاد کیا کروں، بعض جگہ ایک ممکن اور معمولی واقعہ کو شاعرانہ تخیل سے ناممکن

یا مستبعد بنا دیتے ہیں، مثلاً

خلق را بیدار باید بود زاب چشم من | وین عجب کاں دم کہ میگریم کسی بیدار نیست
من از دست تو در عالم نہم روی | ولیکن چوں تو در عالم بنا شد
بہ لطف دلبر من در جہاں نہ بینی کس | کہ دوستی کند و دشمنی بیفزاید
گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم | چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

اسی طرح جدتِ ادا کے سینکڑوں اسلوب پیدا کیے، جن کی الگ الگ تشریح نہیں ہو سکتی، اشعار ذیل سے ایک عام اندازہ ہو گا،

دنبال تو بودن گنہ از جانب ما نیست | با غمزہ بگو تا دل مردم نہ رباید
ز من مپرس کہ از دست او دلم چون است | از و بپرس کہ انگشتہاش پُر خون است
توبہ کنند از گناہ خلق بہ شعباں | در رمضاں نیز چشم ہای تو مست است

امیر خسرو کی ایک غزل ہے،

ای مسلماناں کس روزہ بدینساں دارد

یہ خیال یہیں سے لیا ہے،

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم | شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام
بہ چشم رفتہ ما را کہ می برد پیغام | بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است
دی زمانے بہ سعدی بہ تکلف بنشست | فتنہ بنشست و چو برخاست قیامت برخاست
ما نامہ بہ او سپردہ بودیم | او نافہ مشک از فرآورد
ای تماشاگاہ عالم روے تو | تو کجا بہر تماشا می روی
اے مسلماناں بہ فریاد م رسید | کاں فلانے بے وفائی می کند

یار من او باش و قلاش است و رند   لیک بر من پارسائی می کند

قاضی شہر عاشقاں باید   کہ بیک شاہد اختصار کند

شاہد معشوق کو کہتے ہیں اور گواہ کو بھی، مقدمات کے ثبوت میں عموماً دو گواہ ضرور ہیں، شاعر کہتا ہے کہ گو عام قاعدہ یہی ہے کہ مقدمہ کے ثبوت میں دو گواہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عاشقوں کے ملک میں قاضی کو ایک ہی شاہد (معشوق) پر اکتفا کرنا چاہئے شاہد کے ذو معنین ہونے نے جو لطف پیدا کیا ہے وہ مخفی نہیں،

برخیز کہ چشم ہائے مستت   خفتہ است و ہزار فتنہ بیدار

اے محتسب از جواں چہ پرسی   من توبہ نمے کنم کہ پیرم

حضرت امیر خسرو دہلوی[1]

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے، امیر خسرو اسی قبیلے سے ہیں، ان کے والد کا نام سیف الدین محمود ہے، ترکستان میں ایک شہر کش ہے، وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے، فرشتہ اور دولت شاہ نے لکھا ہے کہ بلخ کے امرا میں سے تھے چنگیز خاں کا فتنہ جب اٹھا تو سیف الدین ہجرت کر کے ہندوستان میں آئے، اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدے پر مامور ہوئے محمد تغلق ان کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا، ایک مہم میں کفار سے لڑکر شہید ہوئے،

لیکن صاحب بہارستان سخن، تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کر کے لکھتے ہیں :-

"پس انچہ دولت شاہ در تذکرہ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسرو در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو در حق وے قصائد غرا رست خلاف صریح و محض غلط است، غالباً شاہزادہ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بہ علت اشتراک اسمی سلطان محمد تغلق ان خیال کردہ"

---

[1] امیر خسرو کا حال تمام تذکروں میں کسی قدر تفصیل سے پایا جاتا ہے، تاریخ فرشتہ میں بھی دلچسپ واقعات ہیں لیکن خود امیر موصوف نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب سے زیادہ قابل اعتبار ہیں، اور جہاں تک اسمیں مذکور ہیں، میں نے اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے، امیر کی دیگر تصنیفات سے بھی ان کے واقعات معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ موقع بموقع ان کے حوالے دئے جائیں گے، ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لندن کی قلمی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اسمیں امیر خسرو کی تصنیفات سے انکے حالات مرتب کئے ہیں کہیں کہیں اس سے بھی مدد لی گئی ہے

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے اعزالدین علی شاہ، حسام الدین اور امیر خسرو،

سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر خسرو کی عمر ۹ برس کی تھی، امیر خسرو کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امراے شاہی میں تھے، اور دس ہزار فوج کے افسر تھے، امیر خسرو ۶۵۱ھ میں بمقام پٹیالی[۲] پیدا ہوئے، قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے، مجذوب نے دور ہی سے دیکھکر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائیگا، مجذوب صاحب کے کمالات معنوی کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن اون کے شاعرانہ مذاق کا تسلیم کرنا مشکل ہے خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت،

جب اُنھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا، اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی، جو کچھ موزوں ناموزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیوں پر اسی کی مشق کیا کرتے تھے، خواجہ اصیل کوتوال کے نائب تھے وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کے لئے بلا لیا کرتے تھے، ایک دن بلایا تو امیر خسرو بھی ساتھ گئے، خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے، سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ غوں غاں کرتا ہے معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے یا نہیں؟ آپ ذرا

---

[۱] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو، باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں خسرو دلی میں پیدا ہوئے لیکن یہی روایت بنظاہر صحیح ہے تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان زا ہیں لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو [۲] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا، اور کہتے ہیں کسی زمانہ میں دریاے گنگ اس کے نیچے بہتا تھا لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے، یہاں اب اسٹیشن بھی ہے،

اس کے کلام کو سن لیجئے، خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی، امیر خسرو کو دی کہ کوئی شعر پڑھو، امیر نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا، چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی لوگوں پر اثر ہوا، سب کی آنکھیں بھر آئیں، اور سب نے بے اختیار تحسین کی، ان کے استاد نے کہا شعر گوئی کا امتحان لیجئے، خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ ان کو ملا کر شعر کہو، مو، بیضہ، تیر، خربزہ، امیر نے برجستہ کہا،

ہر موے کہ در دو زلف آں صنم است[1]	صد بیضہ عنبریں برآں موے ضم است
چوں تیر بداں راس دلش راز یراکہ	چوں خربوزہ دندانش درون شکم است

خواجہ عزیز الدین کو سخت حیرت ہوئی، پوچھا کیا نام ہے؟ انھوں نے کہا خسرو، باپ کا نام پوچھا، انھوں نے اصل نام کے بجائے قبیلہ کا نام بتایا، یعنی لاچین، خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا لاچین یعنی چین نہیں،، پھر کہا،، ترک خطا است، یعنی ان کو ترک کہنا خطا ہے،، انھوں نے اسی لفظ کو الٹ کر کہا،، بے خطا ترک است،، یعنی قطعاً وہ ترک ہے، خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہے، اس لئے تم کو سلطانی تخلص رکھنا چاہئے، چنانچہ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں[2] میں یہی تخلص ہے،

امیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی، لیکن تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی، تاہم یہ قطعی ہے کہ ۱۵۔۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و فنون سے فارغ ہو چکے تھے،

درباری تعلقات امیر خسرو جب سن رشد کو پہونچے تو دلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا، اس کے امرائے دربار میں سے

---

[1] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا ہم نے اسی طرح نقل کر دیا [2] یہ تمام حالات اپنے امیر خسرو نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں

کشلو خاں معروف بہ چھجو[1] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا، وہ سلطان کا بھتیجا اور باربک کے عہدے پر مامور تھا، فرشتہ میں لکھا ہے کہ مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہوگیا تھا، اور مصر، شام، روم، بغداد، عراق، خراسان، ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اس کے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہوکر جاتے تھے، بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا سب لٹا دیا، یہاں تک کہ خود اس کے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ نہ رہا،

امیر خسرو کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے، سب سے پہلے اس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اس کے دربار میں ملازم رہے، چنانچہ اکثر قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں، ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں،

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح   ہمدمی با باد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجا است   آسماں روے ملک چھجو نمود

[1] چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں، امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان معظم کشلو خاں عرف چھجو کے دربار میں پہنچا، اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں، بدایونی (صفحہ ۱۵۱ جلد اول) میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا، اور سلطان معز الدین کیقباد نے اسکی بیٹی سے شادی کی تھی،

فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد ابن عز الدین، سلطان غیاث الدین بلبن کا برادرزادہ تھا، سلطان نے اسکو باربک مقرر کرکے خان معظم کو کشلی خاں خطاب دیا، بدایونی (صفحہ ۱۲۳) میں ملک چھجو کو برادرزادہ سلطان غیاث الدین لکھ کر لکھا ہے کہ اسکو کشلو خاں خطاب ملا تھا، ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین کشلو خاں، چھجو ایک ہی شخص ہیں،

امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے،

زشاہاں کسے کا دلم کرد یاد   معزالدنا بود شہ کیقباد

لیکن اس سے کتلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا، کتلو خاں امرا میں سے تھا، بادشاہ نہ تھا، بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر کی قدر دانی کی وہ معزالدین کیقباد تھا، امیر خسرو اکثر کتلو خاں کے دربار میں قصیدے لکھ کر لیجاتے اور مجلس گرم کرتے تھے، ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) بھی موجود تھا اور شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے، امیر خسرو نے اپنی زمزمہ سنجی سے یہ سماں باندھا کہ بغرا خاں نہایت متاثر ہوا، اور صلہ کے طور پر لگن بھر کر روپیے دیئے، کتلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا وابستہ دولت دوسرے دربار کا احسان اٹھائے، چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوئے، امیر خسرو نے اس کے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اس کی تلافی کرنی چاہی لیکن کتلو خاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی،[1]

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا، امیر خسرو نے ملک چھجو سے مایوس ہو کر سامانہ کا قصد کیا، بغرا خاں نے نہایت قدر و عزت کی اور ندیم خاص بنایا، اسی زمانہ میں یعنی ۶۷۸ھ[2] میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی، اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں، بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ لیا، امیر خسرو بھی اس سفر میں ساتھ گئے،[3] سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کرکے دلی واپس

---

[1] یہ تمام حالات خود امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں [2] تاریخ فرشتہ [3] امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے لیکن اس قدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱ پر)

آیا اور بنگالہ کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی، امیر خسرو کو اب زیادہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا، دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی ان کے قیام پر مصر تھے، لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ رخصت لے کر دلی میں آئے، اتفاق سے اسی زمانے میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلی میں آیا تھا، وہ نہایت قابل، صاحب علم، فیاض اور قدر دان علم و فن تھا، تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گذر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا، اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری، خمسۂ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے، ایک بیاض تیار کی تھی، جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کر کے درج کئے تھے، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے،

یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی، امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہاتھ آئی، ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے، اور بیاضوں میں درج کرتے تھے[1]

امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا، سلطان محمد نے اُن کو بلا کر شعرائے خاص میں داخل کیا، اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو کر گیا تو ان کو اور ان کے ساتھ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا، پانچ برس تک یہ اس کے دربار میں رہے، اس زمانہ میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغو خاں ایران کا حکمران تھا، اس کے امرا میں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لے کر

(بقیہ حاشیہ ص) تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے ایک اور دقت سخت تر یہ ہے کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ سخت غلط ہے، گویا بالکل مسخ ہو گیا ہے، [1] تاریخ فرشتہ،

لاہور اور دیپال پور کو فتح اور غارت کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا، سلطان محمد قاآن نے ملتان سے نکل کر تیمور خاں کو شکست دی لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی ایک تالاب کے کنارے پانچسو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا، یہ موقع پاکر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا، سلطان محمد نے انہی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور گو بار بار ان کو شکستیں دیں لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا اور زخم کھاکر مر گیا[1]، امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے، چنانچہ تاتاری ان کو گرفتار کر کے بلخ لے گئے، یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا[2]، امیر خسرو نے نہایت پر اثر مرثیے لکھے، اور دلی بھیجے، مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے، چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں،

واقعہ است این یا بلا از آسمان آمد پدید ۔۔۔ آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

راہ در بنیاد عالم داد سیلِ فتنہ را ۔۔۔ رخنہ کامسال در ہندوستاں آمد پدید

مجلس یاران پریشان شد چو برگِ گل ز باد ۔۔۔ برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید

بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چار سو ۔۔۔ پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

جمع شد سیارہ در چشم مگر طوفاں شود ۔۔۔ چوں بہ برج آبی انجم را قراں آمد پدید

من نخواہم جز ہماں جمعیت وایں کے شود

خود محال ست ایں بنات النعش پرویں کے شود

تا چہ ساعت بد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید ۔۔۔ تیغ کافر کش برائے کشتن کافر کشید

انچہ حاضر بود لشکر، لشکرِ دیگر نہ جست ۔۔۔ زاں کہ رستم را نشاید منتِ لشکر کشید

[1] تاریخ فرشتہ [2] بدایونی ص ۱۳۱،

چوں خبر کردندش از دشمن بداں وقتے کہ داشت | بے محابا خشم در سر کرد و رایت بر کشید
یک کشش از مولتانش تا بہ لاہور او فتاد | یعنی اندر عہد من کافر قوانند سر کشید
آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خونِ شاں | کز زمین باید شفق را گونۂ احمر کشید
او درین تدبیر و آگہ نے کہ تدبیر فلک | صفحۂ تدبیر را خطِ مشیت در کشید

تا چہ ساعت بُد کہ کافر بر سر لشکر کشید
جوق جوق از آب بگزشتند و ناگہ در رسید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے، اخیر کے بند جہاں شہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پُر اثر ہیں،

دو برس کے بعد امیر نے کسی طرح تاتاریوں کے ہات سے رہائی پائی، اور دلی میں آئے خان شہید کے مرنے پر جو مرثیہ لکھا تھا، غیاث الدین بلبن کے دربار میں جاکر پڑھا دربار میں کہرام پڑگیا، کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، سلطان اس قدر رویا کہ بخار آگیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کرگیا،

امیر دلی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اس کے خلافِ وصیت، اس کے پوتے کیقباد کو جو بغرا خاں کا بیٹا تھا، تخت نشین کیا،

کیقباد نے امیر خسرو کو دربار میں طلب کیا، لیکن چونکہ عنان سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی، اور وہ امیر سے صاف نہ تھا، امیر نے تعلق پسند نہ کیا، اور خان جہاں جو امرائے شاہی میں تھا، اس کی ملازمت اختیار کی،

خان جہاں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا، اور امیر کو ساتھ لے گیا، چنانچہ خود قران السعدین

میں فرماتے ہیں.

خانِ جہاں حاتمِ مفلس نواز | گشت بہ اقطاعِ اودہ سرفراز
من کہ بُدم چاکرِ او پیش ازاں | کرد کرم انچہ کہ بد بیش ازاں
تا زچناں بخشش خاطر فریب | بند شدہ لازمۂ آں رکیب
مدا دوم بروز لطف چناں | گیست کہ از لطف تبا بد عناں
در اودھ از بخشش او تا دو سال | ہیچ غم و نالہ بنود از مثال

دو برس تک اودھ میں رہے، ان کی والدہ کو اُن سے حد سے زیادہ محبت تھی. وہ دلی میں تھیں، اور ان کے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی، امیر کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی، چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلی میں آئے، ماں نے گلے سے لگایا اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے.

مادرم آں خستۂ بیمار من | چوں نظر افگند بہ دیدار من
پردہ ز روے شفقت برگرفت | اشک فشاناں بہ برم درگرفت

کیقباد جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی، اس کا باپ بغرا خاں، بنگال میں تھا، یہ حالت سُن کر بنگال سے روانہ ہوا، کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا، چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کرکے دلی سے روانہ ہوا، راہ میں نامہ و پیغام ہوتے رہے، آخر صلح پر خاتمہ ہوا، اور کیقباد دلی کو واپس آگیا،

امیر خسرو نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں؛

زہے ملک خوشی چوں دو سلطاں یکے شد | زہے عہد خوش چوں دو پیماں یکے شد
پسر بادشاہے، پدر نیز سلطاں | کنوں ملک بیں چوں دو سلطاں یکے شد

زہر جہانداری و بادشاہی — جہان او و شاہ جہانبان یکے شد
یکے ناصر عہد محمود سلطان — کہ فرمانش در چار ارکان یکے شد
دگر شہ معز جہاں کیقبادے — کہ در ضبطش ایران و توران یکے شد

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات نظم کے پیرایہ میں آئیں، امیر خسرو کو بلا کر یہ خواہش ظاہر[1] کی، چنانچہ امیر نے چھ مہینے کی مدت میں قرآن السعدین لکھی، جس میں باپ بیٹے کے مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اس وقت امیر کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۶۸۸ تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ساختہ گشت از روش خامہ — از بس شش ماہ چنیں نامہ
در رمضان شد بہ سعادت تمام — یافت قرآں نامۂ سعدین نام
انچہ بہ تاریخ ز ہجرت گذشت — بود سن ششصد و ہشتاد و ہشت
سال من امروز اگر بر رسی — راست بگویم ہمہ شش ۳۶ تو دو سی

کیقباد عیاشی میں بیمار ہو کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مر گیا یا مارا گیا، اس کے بعد اس کا خرد سال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا، وہ بالکل بچہ تھا، تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اتار کر قید کر دیا، اب اس خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا، اس لئے ترکی امرائے دربار میں سے ملک فیروز شایستہ خاں خلجی جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا، تختِ سلطنت پر بیٹھا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا، وہ بڑے عظمت اور اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا، اس کے ساتھ نہایت صاحب مذاق، رنگین طبع، خوش صحبت تھا، شعر بھی کہتا تھا، چنانچہ

[1] بدایونی،

بدایونی نے اس کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں؛

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمے خواہم | واں روی چو گلنارت تفسیدہ نمے خواہم

بے پیر منت خواہم یک شب بکنار آئی | ہاں بانگ بلندست ایں پوشیدہ نمے خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جس قدر تھے، سب قابل، اہل فن، موزون طبع اور رنگیں مزاج تھے مثلاً ملک تاج الدین کرجی، ملک فخر الدین، ملک اعز الدین، ملک قرابیگ، ملک نصرت، ملک حبیب، ملک کمال الدین، ابو المعالی، ملک نصیر الدین کرانی، ملک سعد الدین انیس اور ہم صحبت تھے،

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لئے انتخاب کئے تھے، چنانچہ تاج الدین عراقی خواجہ حسن دہلوی، موید جاجرمی، موید دیوانہ، امیر ارسلان، اختیار الدین باقی ندمائے خاص میں تھے، ساقی، مغنی اور مطرب بھی وہ لوگ تھے جو زمانہ میں انتخاب تھے مثلاً امیر خاصہ، حمید، راجہ، نظام، محمد شاہ، نصیر خاں، بہروز،

ایسے گوناگوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لئے امیر خسرو سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا، وہ عالم بھی تھے، فاضل بھی، مغنی بھی، مطرب بھی، اور شاعر تو تھے ہی معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا، اسی وقت اُس نے امیر خسرو کو قدردانی کی نگاہ سے دیکھا تھا، چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کرکے خاص اپنا باس عنایت کیا تھا، تخت پر بیٹھا تو امیر کو ندیم خاص بنایا، اور مصحف[2] داری اور امارت کا عہدہ دیا، اس کے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا، ان کے لئے مقرر کیا، امیر خسرو جو "امیر" کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے،

[1] فرشتہ [2] جس کو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی، اسکو مصحف دار کہتے تھے،

امیر نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کئے اور تاج الفتوح نام رکھا، اسکی تفصیلی کیفیت آگے آئے گی، جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۵ھ میں دھوکے سے قتل کرا دیا، اور خود تخت نشین ہوا، سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بے رحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اس کی طینت کا جوہر تھا، تاہم بہت بڑے عزم و استقلال اور شوکت و شان کا فرماں روا گذرا ہے تعجب انگیز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑ کر علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت خیز نہیں ہیں اس کا دربار فقرار علمار فضلا و شعرا سے ہر وقت معمور رہتا تھا، ان میں بعض کے نام حسب ذیل[۱]

قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی فخر الدین کرمانی، مولانا نصیر الدین غنی، مولانا تاج الدین مقدم، قاضی ضیار الدین، مولانا ظہیر الدین لنگ، مولانا ظہیر الدین بھکری، قاضی زین الدین ناقلہ، مولانا شرکتی، مولانا نصیر الدین رازی، مولانا علاء الدین صدر شریف، مولانا میران بابک کلہ، مولانا نجیب الدین بیانوی، مولانا شمس الدین، مولانا صدر الدین، مولانا علاء الدین لاہوری قاضی شمس الدین کازرونی، مولانا شمس الدین بخشی، مولانا شمس الدین، مولانا صدر الدین یادی مولانا معین الدین لولوی، مولانا افتخار الدین رازی، مولانا معیر الدین اندپتی، مولانا نجم الدین مولانا حمید الدین بلوری، مولانا علاء الدین کرک، مولانا حسام الدین سادہ، محی الدین کاشانی مولانا کمال الدین کوبی، مولانا وجیہ الدین کابلی، مولانا منہاج الدین، مولانا نظام الدین کلاتی، مولانا نصیر الدین کری، مولانا نصیر الدین بوہی، مولانا علاء الدین تاجر، مولانا کریم الدین جوہری، مولانا محب ملتانی، مولانا حمید الدین، مولانا برہان الدین بھکری، مولانا افتخار الدین مولانا حمید الدین ملتانی، مولانا گل محمد شیرازی، مولانا حسام الدین سرخہ، مولانا شہاب الدین

[۱] یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہیں،

ملتانی، مولانا فخر الدین نسبوی، مولانا فخر الدین شقاقلی، مولانا علیم الدین،

قرار، مولانا شاطی، مولانا علاء الدین سفری، خواجہ زکی،

واعظین، مولانا حسام الدین درویش، مولانا شہاب الدین، مولانا کریم،

شعراء، خواجہ حسن دہلوی، صدر الدین عالی، فخر الدین قواس، حمید الدین راجہ،

مولانا عارف عبد الحکیم، شہاب الدین، لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا تھا،

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر موصوف کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے، ان کے بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں کہ وہ بھی امیر ہی کا فیض ہی، علاء الدین نے امیر خسرو کا ایک ہزار سالانہ ٹنکہ مقرر کیا تھا[1]، امیر نے سلطان علاء الدین کی تمام فتوحات کو نہایت تفصیل سے لکھا، جس کا نام خزائن الفتوح ہے، تفصیل اس کی آگے آئے گی،

۶۹۰ھ میں امیر کی والدہ اور ان کے بھائی حسام الدین نے انتقال کیا، چنانچہ لیلی مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُر درد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے،

نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا، چنانچہ ہر کتاب سلطان علاؤ الدین کے نام سے منسون ہے، سب سے آخری مثنوی ہشت بہشت ہے، جو ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی،

اسی زمانہ میں امیر نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر بیعت کی، چنانچہ تفصیل آگے آئے گی، سلطان علاء الدین نے ۲۱ برس کی حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں وفات کی، اس کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین (حکومت ۳ ماہ) اور اس کے بعد ۷۱۷ھ میں قطب الدین مبارک بن علاء الدین خلجی بادشاہ ہوا، وہ اگرچہ نہایت عیاش، بے مغز،

[1] تاریخ فرشتہ، غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا،

اور سبک سر تھا، لیکن امیر کی قدر دانی سب سے بڑھ کر کی، چنانچہ امیر نے جب ۷۱۸ھ میں اس کے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپئے دئے، چنانچہ خود امیر قطب الدین کی زبان سے لکھتے ہیں،

بہ تاریخ ہنچوں من اسکندرے | کند ہر کہ آرایش دفترے
ز گنج گراں مایۂ بے شمار | دہم بار بیتش نہ آں پیلبار
مرا خود درس رہ پدر شہ دلیل | کہ میداد زر، ہم ترازوے پیل
شناسد کسے کش خرد رہنموں | کہ از پیلبار است وزنش فزوں
چہ میراث شد پیل زر دادنم | نہ زیبا است زیں سہل تر دادنم
شہا! گنج بخشا! کرم گسترا | معانی شناسا، سخن داورا
چنیں بخششے کز تو جم یافتم | در ایام پیشینہ کم یافتم
کنوں لا مد از سحر سنج چو من | بہ اندازۂ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نومسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دے کر قلمدانِ وزارت عطا کیا تھا، اس نے ۷۲۱ھ میں قطب الدین کو قتل کر کے، خود تخت حکومت پر جلوس کیا، چونکہ اس نے دربار میں تمام ہندو بھر دئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کئے، امرا نے بغاوت کی، چنانچہ ۴ مہینے کی حکومت کے بعد ۷۲۲ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا،

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور امرائے دربار میں سے غازی ملک نے جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندنی تھی، دربار میں پکار کر کہا کہ مجھ کو تخت سلطنت کی آرزو نہیں، خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے، لیکن چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا، اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا،

اس لئے سب نے بہ اتفاق اسی کو بادشاہ بنایا، وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور

ہوا، اس نے نہایت عدل واحسان سے حکومت کی اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں،

تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے، امیر خسرو کی اس نے نہایت قدر دانی

کی اور ان کو دولت اور مال سے نہال کر دیا، امیر نے بھی اس کے احسانات کا حق ادا کیا،

چنانچہ اس کے نام پر تغلق نامہ لکھا، جو تغلق کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ ہے،

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر خسرو ساتھ گئے، تغلق واپس آیا، لیکن امیر خسرو

وہاں رہ گئے، اسی اثنار میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیار نے انتقال

کیا، امیر یلغار کرتے ہوئے دلی میں آئے اور جو کچھ زر و مال پاس تھا، خواجہ صاحب کے

نام پر نثار کر دیا، ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے، چھ مہینے

کے بعد ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا، خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو وفات

میں دفن کرنا، لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنا چاہی، لیکن ایک خواجہ سرانے جو وزارت

کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا، غرض خواجہ

صاحب کے پائنتی دفن کیا، اور اس سے بڑھ کر ان کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی[1]، ان کا مقبرہ

مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امرار میں سے تھا، تعمیر کرایا، اور ملا شہاب معمائی نے

تاریخ کہہ کر لوح پر کندہ کرائی،

"شد عدیم المثل" یک تاریخ او   وال دگر شد "طوطی شکر مقال"

خاندان اور آل واولاد | امیر کو خدا نے فرزندان معنوی کے علاوہ اولاد ظاہری بھی عنایت

کی تھی[2]، ان کے ایک صاحبزادہ کا نام ملک احمد ہے، وہ شاعر تھے، اور سلطان فیروزشاہ

---

[1] خزانہ عامرہ [2] فرشتہ حالات خسرو،

کے دربار میں ندیم تھے، ان کی شاعری نے چنداں فروغ حاصل نہیں کیا، لیکن شعر و شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے، اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے، اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے، چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہل فن اسکو تسلیم کرتے ہیں، ظہیر کا شعر ہے،

کلاہِ گوشۂ حکمِ تو از طریقِ نفاذ　　ربودہ از سر گردوں کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا، جس سے مصرع کی ترکیب چست ہو گئی، بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے،

ایں سہل ہمی بود کہ گو گرد سرخ خواست　　گر نانِ خواجہ خواستی آں راچہ کردے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی،

ایں سہل بود کہ آب حیات خواست　　گر نانِ خواجہ خواستی آں راچہ کردے

نان کے ساتھ آب حیات کے مقابلہ نے لطف پیدا کر دیا،

ایک اور شعر تھا،

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرنج　　نرخ گہر بہ طعن خریدار نشکند

ملک موصوف نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا،

گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر خسرو کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے، بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا کہ "ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے، اس لئے بادشاہ اور درباری اس کو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے، اور غنیمت جانتے تھے،

امیر خسرو کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں

کی ایسی بے قدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا، جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر نے لیلیٰ مجنوں لکھی، اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں،

اے زعفت فگندہ برقع نور | ہم عفیفہ بنام و ہم مستور
کاش ماہ تو ہم بہ چہ بودے | در رحم طفلِ ہشت مہ بودے
لیک چوں دادہ خدای رواست | با خدا دادگاں ستیزہ خطاست
من پذیرفتم انچہ یزداں داد | کانچہ او داد بازنتواں داد
پدرم ہم زمادر است آخر | مادرم نیز دختر است آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم نہ پیدا ہوتیں، یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں، پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے دیئے کو کون ٹال سکتا ہے، اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا، اور میری ماں بھی تو آخر عورت ہی تھی،

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کی حالت نہایت پست تھی، امیر خسرو اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے، لیکن بیٹی سے کہتے ہیں کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر نہ جھانکنا

دوک و سوزن گذاشتن نہ فن است | کالت پردہ پوشی بدن است
یا بہ دامانِ عافیت سر کن | رو بہ دیوار و پشت بر در کن
در تماشائے روزنت ہوس است | روزنت چشم سوزنِ تو بس است

امیر کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی، بڑی عمر کو بھی پہنچ کر وہ اس جوش محبت سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں، اور وہ کی معقول ملازمت صرف اس بنا پر چھوڑ دی کہ ماں دلی میں تھیں، اور ان کو یاد کیا کرتی تھیں، اور وہ جب

دلی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے،

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں، اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے، چنانچہ دو نہریں دودھ کی اُس میں جاری ہیں، ۶۹۸ھ میں اُنھوں نے انتقال کیا، اسی سال ان کے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا، لیلیٰ مجنوں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے،

امسال دو نور ز اخترم رفت — ہم مادر و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بخت خفتہ من — گم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد پیچم — چرخ از دو طپانچہ کرد ہیچم
ماتم دو شد و غم دو افتاد — فریاد کہ ماتم دو افتاد
حیف است دو داغ چون منے را — یک شعلہ بس است خرمنے را
یک سینہ دو بار بر نگیرد — یک سر دو خمار بر نگیرد
چون مادر من بزیر خاک است — گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر — روی از چہ نمی نمائی آخر
خنداں ز دل زمین بروں آئی — بر گریۂ زار من بہ بخشائے،
ہر جا کہ ز پای تو غباری است — ما را ز بہشت یادگاری است
ذاتِ تو کہ حفظ جان من بود — پشتِ من و پشت بانِ من بود
روزے کہ لب تو در سخن بود — پند تو صلاحِ کار من بود

امروز منم به پہر پیوند — خاموشی تو ہمی دہد پند

اڑتالیس برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں، جس طرح کمسن بچہ ماں کے لئے بلکتا ہے، اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خونِ جگر سے رنگین ہیں۔

امیر خسرو اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے، اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے، جو عام دنیاداروں کا طریقہ ہے، لیکن یہ امر ان کی اصل فطرت کے خلاف تھا، دربار داری، خوشامد اور شخص پرستی سے ان کو طبعی نفرت تھی، اور موقع بموقع یہ خیالات بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتے تھے، لیلیٰ مجنوں ۶۹۸ھ میں لکھی تھی، جب ان کو سلطان علاء الدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا، تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں،

شب تا سحر و ز صبح تا شام — در گوشہ غم نگیرم آرام

باشم ز برائے نفس خود رائے — پیش چو خودے، ستادہ بر پائے

اس پر مزید یہ ہوا کہ ان کے والد نے ان کو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قدموں پر ڈال دیا تھا، اور برکت کے لئے بیعت کرا دی تھی، خواجہ صاحب کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی، امیر خسرو کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی تھا، وہ سرتاپا عشق تھے، اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی، آخر یہ نوبت پہنچی کہ ۱۳ھ؟ میں جیسا کہ خود افضل الفوائد میں لکھا ہے، خواجہ صاحب کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی، خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی، اور مریدانِ خاص میں داخل کیا، قدرت اللہ قدرت نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ امیر نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا سب لٹا دیا، ... ہو کے بیٹھ گئے،

خواجہ صاحب سے امیر کی ارادت اور عقیدت، عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی، ہروقت ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے، خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا، کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کر دوں گا، دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے

الٰہی بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش،

ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر، ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے، امیر خسرو بھی حاضر تھے، خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو،

ع ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس وقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی، امیر نے اس کی طرف اشارہ کرکے برجستہ کہا، ع

ما قبلہ راست کردیم برطرف کجکلاہے

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے، میں نے اس کا شان نزول پوچھا، ملا علی احمد مہر کن نے واقعہ بیان کیا، مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ غش کھا کر گرے، دیکھا تو دم نہ تھا،

تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڈھ

خواجہ صاحب نے امیر خسرو کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا اور اسی لقب سے پکارتے تھے امیر نے جابجا اس پر فخر کیا ہے، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہے فرماتے ہیں،

بر زبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت دست ترک اللہ گیر وہم بہ اللہش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا، یہ بھی فرمایا

کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو بھی دفن کراتا،

امیر نے تصوف میں جو مدارج حاصل کیے، ان کو ہم نہ جان سکتے اور نہ بیان کر سکتے ہیں، یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے، وہ اسی وادیِ ایمن کی شرر باریاں ہیں،

امیر کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں، حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے، امیر کا عین شباب تھا کہ ایک دن اتفاق سے ان کی دوکان کے سامنے سے گذرے، آفتاب حسن کی شعاعیں اُن پر بھی پڑیں، وہیں ٹھہر گئے اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو، حسن نے کہا کہ ایک پلڑے میں روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے پلڑے میں سونا رکھے، سونے کا پلہ جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں، امیر نے کہا اور خریدار مفلس ہو؟ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے درد اور نیاز لیتا ہوں، اس انداز گفتگو نے امیر کو اور بھی بے اختیار کر دیا، فوراً نظام الدین اولیا کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، حسن نے گو ناوک اندازی کی تھی، لیکن خود بھی شکار ہو گئے، اسی وقت دوکان بند کر کے خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے، اور اپنے والدادہ (امیر خسرو) سے ملے، اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے،[1]

---

[1] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے، لیکن صاحب بہارستان سخن نے اس کی معقول بنا پر تکذیب کی ہے، اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے" بہ قیاس چناں در می آید کہ حسن را بہ نسبت امیر خسرو گونہ تقدم باشد، چہ امیر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن، قصائد غرا ہست و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کمتر چیزے میتواں یافت؟

امیر سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے تھے، امیر نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے، چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو خسرو کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے، دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی، امیر نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی،

زیں دلِ خود کام کارمن بہ رسوائی کشید　　خسرواً فرمانِ دل بردن ہمیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر کے ملنے سے منع کر دیا، لیکن کچھ اثر نہ ہوا، خان شہید نے غصہ میں آ کر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے، حسن سیدھے خسرو کے پاس گئے، خان شہید کو اسی وقت پرچہ لگا، نہایت متحیر ہوا، اور امیر کو بلوا بھیجا، آئے تو کہا کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہات نکال کر دکھایا اور کہا، ع

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں خسرو کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے[۱]

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے، اور صنفِ غزل پر ان کا خاص احسان ہے اس لئے ان کے شیدائی، امیر خسرو ہی کے تذکرہ میں ان کے اشعار نقل کرتے ہیں،

خلق گوید، دل از صبر بجا آور باز　　ای دل از صبر نشانے دہ اگر جائے ہست

ایکہ نظارۂ دیوانہ نہ کردی ہرگز　　قدمے رنجہ کن ایں سو کہ رسوائے ہست

---

[۱] یہ تمام واقعات فرشتہ نے امیر خسرو کے تذکرہ میں لکھے ہیں لیکن اخیر کا واقعہ آج کل کون تسلیم کریگا،

برچون تو، کسی دگر گزیدن — کاری دگرست، کار من نیست
گفتی که چرا جدائی از من — این از فلک ست از حسن نیست

باز این دلم به سوی دلارام می رود — از دام جستہ، باز سوی دام می رود
ایام در نیامده با ما به دوستی — وان شوخ هم به سیرت ایام می رود

ای خواجه! در محلہ تقوی اقامت گیر — در کوی عاشقی نتوان نیکنام شد
عقلم که زین بر ابلق ایام می نهاد — آخر بتازیانۂ عشق تو رام شد

طرفه سرو کاری است که با وعدۂ معشوق — صابر نتوان بود و تقاضا نتوان کرد

از حسن این چه سوال ست که معشوق تو کیست — این سخن را چه جواب ست تو هم می دانی

دو سه بار، با تو گفتم که مرا بهیچ لبان — نه شد اتفاق، شاید که به این بها گرانم

تلخ کردم جهانیان را خواب — زان دعاها که مستجاب نبود
ای حسن یار گر خطاے کرد — هم شکایت ازو صواب نبود

به تقوئی نام نیکو برده بودم — نکورویان مرا بدنام کردند
گفتی که چرا حال دل خویش نه گوئی — من خود کنم آغاز به پایان که رساند

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو سوز و گداز، اور جذبہ و اثر ان کے کلام میں موجود ہے ان کے کشتۂ محبت (امیر خسرو) میں بھی نہیں۔

جامعیت اور کمالات

ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا، اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہونگے، صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسی، سعدی، انوری، حافظ

عرفی، نظیری بے شبہہ اقلیمِ سخن کے جم وکے ہیں، لیکن ان کی حدودِ حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے، فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے، لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہای سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع وبدائع کا تو شمار نہیں، تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، فردوسی کے اشعار کی تعداد کم وبیش ستر ہزار ہے، صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے، لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں، اکثر تذکروں میں خود امیر خسرو کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے، امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے، اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں، چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں،

انواعِ شاعری

اشعار کی تعداد

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے، اسی قدر برج بھاکا میں ہے، کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں،

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے، عربی میں ادبای عرب کے ہمسر ہیں،

سنسکرت کے ماہر ہیں، چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے، ع من قدرے بر سر ایں کار شدم،

سنسکرت دا[نی]

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے، اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے، اُنھون نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں مین لکھی اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور، صنائع و بدائع پر بیکار گیا، لیکن انکی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کرسکتا ہے،

موسیقی | موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب، ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کرسکا، چنانچہ اسکی تفصیل مستقل عنوان میں آتی ہی،

فقر وتصوف | ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر وتصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیاے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، چنانچہ اس کا ذکر بھی الگ عنوان میں آئیگا

عدیم الفرصتی | ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ اون کو، ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا، تو سخت حیرت ہوتی ہے، وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباروں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی، کام جو سپرد تھا وہ شاعری نہ تھی بلکہ اور اور اشغال تھے، لیلیٰ مجنون کے خاتمہ میں لکھتے ہیں،

مسکین من مستمند مدہوش ۔۔۔ از سوختگی چو دیگ پر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام ۔۔۔ در گوشۂ غم نہ گیرم آرام
باشم ز براے نفس خود رای ۔۔۔ پیش چو خودی استادہ بر پاے

یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے، صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہون

تا خون نہ رود ز پاے تا سر ۔۔۔ دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک، پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا، کھانا کھانے کو نہیں ملتا،

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چندان

ناموزوں نہ ہوگا

موسیقی امیر کی ہمہ گیر طبیعت نے اُس نازک اور لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا، ان کے زمانہ کا مشہور جگت استاد جو تمام ہندوستان کا استاد تھا، نایک گوپال تھا اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح کاندھے پر لے کر چلتے تھے، سلطان علاء الدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا، امیر خسرو نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں، نایک گوپال سے گانے کی فرمایش کیجائے، نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا، ساتویں دفعہ امیر بھی اپنے شاگردوں کو لیکر دربار میں آئے، گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا، ان سے گانے کی فرمایش کی، امیر نے کہا میں مغل ہوں، ہندوستانی گانا کچھ یوں ہی سا جانتا ہوں، پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا

گوپال نے گانا شروع کیا، امیر نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں، پھر خود اس کو ادا کیا، گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا، امیر نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں، غرض گوپال جو راگ راگنی اور سر ادا کرتا تھا امیر اس کو اپنا ایجاد ثابت کرتے جاتے تھے، بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے، اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں، پھر جو گایا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا،[1]

---

[1] عالمگیری امرا میں فقیر اللہ جس کا لقب سیف خاں تھا ایک مشہور امیر تھا، ناصر علی نے اسی کی شان میں کہا ہے

گفتگوے طوطی از آئینہ می خیزد علی   گر بنا شد سیف خاں، ار النفس در کار نیست

وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا، فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل تھی، فقیر اللہ نے اس کا فارسی ترجمہ کیا، اور آدھے سے زیادہ فوائد اضافہ کیے اور اُس کا نام راگ درپن رکھا، چنانچہ مآثر الامرا جلد دوم ص ۲۹۰ مطبوعہ کلکتہ

امیر خسرو چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے بھی واقف تھے، اس لئے انھوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دیکر ایک نیا عالم پیدا کر دیا، چنانچہ انکے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں[۱]،

نام راگھائے مخترع امیر خسرو	کن راگوں سے مرکب ہے
مجیر	غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
سازگری	پوربی، گورا، کنگلی، اور ایک فارسی راگ قران السعدین میں اس کا، ذکر کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں زمزمۂ سازگری در عراق کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق
ایمن	ہنڈول اور نیریز
عشاق	سارنگ اور بسنت اور نوا
موافق	توڑی و مالوی و دوگاہ و حسینی
غنم	پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے،
زیلف	کھٹ راگ میں شہ ناز کو ملایا ہے،
فرغنہ	کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے،
سرپردہ	سارنگ، بلاول اور راست کو ترکیب دیا ہے،
باخرز	دیسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) میں یہ تفصیل مذکور ہے اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے، ایک ندوہ کے کتب خانہ میں ہے گوپال کا واقعہ اور آئندہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی کتاب سے لئے ہیں،

[۱] راگ درپن کے دو نسخے جو میرے استعمال میں ہیں، دونوں غلط ہیں، اس لئے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے، اس لئے کہیں کہیں [illegible] نے صرف صورت نویسی کر دیا ہے،

فردوست (یا) پھردوست	کانھڑا، گوری، پوربی، اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
منم	کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے،

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرز، عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے، باقی راگوں میں کچھ یوں ہی ادل بدل کرکے دوسرا نام رکھدیا ہے، قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ، یہ سب بھی امیر خسرو کی ایجاد ہیں، ان میں سے بعض خاص اُن کی ایجاد ہیں، بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے، امیر نے ان میں کچھ تصرف کرکے نام بدل دیا،

تصانیف جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر خسرو نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں یہ بھی مشہور ہے کہ امیر نے خود کسی کتاب میں تصریح کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں، اوحدی نے عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اس سے زیادہ ہندی میں ہے

امیر کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، لیکن بیانات مذکورۂ بالا مبالغہ سے خالی نہیں، چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے، اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے، اس بنا پر ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴، ۵ لاکھ سطریں ہوں، تو چنداں تعجب نہیں، لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھدیا، ہندی کلام مدون نہیں ہوا، اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے، بہرحال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

دیوان[1] تحفۃ الصغر	اس کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے، جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے،
دیوان وسط الحیات	اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۳ یا ۳۴ برس کا کلام ہے، اس میں جو قصائد ہیں سلطان شہید، کشلو خاں وغیرہ کی مدح میں ہیں
غرۃ الکمال	یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا، ۳۴ برس کی عمر یعنی ۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے، دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانحعمری لکھی ہے، سلطان معز الدین کیقباد اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں،
بقیہ نقیہ	دو ہفتہ میں اسکی ترتیب کی اور دیباچہ لکھا، بڑھاپے کا کلام ہے، تاریخ تالیف مذکور نہیں، لیکن سلطان علاؤ الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے، اس لئے کم از کم

[1] امیر نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں، تحفۃ الصغر، اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اس وقت میرے پیش نظر ہے، اور دیوانوں کے دیباچے بھی نظر سے گذرے ہیں، لیکن اس وقت سامنے نہیں، اسلئے انکی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو (آر، آئی، اے، وی، ای) کے اس ریویو سے ماخوذ ہے، جو انھوں نے برٹش میوزیم کے کتبخانہ کی فہرست میں لکھے ہیں اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبد القادر پروفیسر پونہ کالج کا ممنون ہوں

	سنہ ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے،
نہایۃ الکمال	پانچواں دیوان ہے، اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی سنہ ۷۲۰ھ کا مرثیہ اور اس کے ولی عہد کی مدحیں ہیں، ایک قصیدہ میں سنہ ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے، اور اسی سنہ میں خسرو نے انتقال کیا ہے،
قران السعدین	سب سے پہلی مثنوی ہے، سنہ ۶۸۸ھ میں جب کہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی، کیقباد اور بغرا خاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے،
مطلع الانوار	مخزن الاسرار کا جواب ہے، سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی، ۳۳۱۰ شعر ہیں، دو ہفتہ میں تمام ہوئی، سال اختتام سنہ ۶۹۸ھ ہے، تصوف کے مضامین ہیں، اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے،
شیریں خسرو	رجب سنہ ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی ۴۱۲۴ شعر ہیں،
آئینہ اسکندری	سکندر نامہ کا جواب ہے، سال اختتام سنہ ۶۹۹ھ ہے، اشعار کی تعداد ۴۴۵۰ ہے۔

لیلیٰ مجنوں	۲۶۶۰ شعر ہیں، ۶۹۹ھ میں ختم ہوئی،
ہشت بہشت	سلسلۂ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے، ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں، پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر ہے کل ۱۸ ہزار شعر ہیں، خمسۂ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں، یہ پانچوں کتابیں دو برس کی مدت میں تمام ہوئیں،
تاج الفتوح	سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اول یعنی ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں، اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی، مطلع یہ ہے سخن بر نام شاہے کردم آغاز
نہ سپہر	قطب الدین خلجی کے نام پر ہے، نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے، اس مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا ہے، اس وقت امیر خسرو کی عمر ۶۷ برس کی ہو چکی تھی ۷۱۸ھ میں تمام ہوئی،
دول رانی	گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی، خضر خاں

	سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا، وہ دول رانی پر عاشق ہو گیا تھا، اور اس سے شادی کی، خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے، اس کی فرمایش سے امیر خسرو نے اس کو نظم کا لباس پہنایا، اور عشقیہ نام رکھا، چار مہینے میں تمام ہوئی ۴۲۰۰ شعر تھے، خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے، ان کو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا، ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی،
افضل الفوائد	خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں،
اعجاز خسروی	نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کئے ہیں، اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں، ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی تین جلدوں میں ہے
تغلق نامہ	غیاث الدین تغلق کے حالات و فتوحات ہیں،
خزائن الفتوح	سلطان علاء الدین کی فتوحات ہیں،
مناقب ہند، تاریخ دہلی	ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے،

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان تصنیفات کے علاوہ فن حساب اور فن موسیقی میں بھی ان کی تصنیفیں ہیں،

شاعری | امیر خسرو اگرچہ ہندی نژاد تھے، لیکن ایرانی شعرار کو بھی ان کی شاعری اور زباندانی کا اعتراف کرنا پڑا، جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا، طوطی ہند جو اُن کا خطاب تھا، ایرانی بھی اسی خطاب سے ان کو یاد کرتے ہیں،

عرفی به روح خسرو ازیں پارسی شکر دادم | که کام طوطی ہندوستان شود شیریں

خواجہ حافظ شکر شکن شوند همه طوطیانِ ہند | زیں قند پارسی که به بنگاله میرود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لئے شیراز سے دلی میں آئے، اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں، اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحۃً اس واقعہ سے انکار کیا ہے، تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا، اور اس قدر تو تمام مورخوں اور تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انھوں نے بڑھاپے کا عذر کیا، اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں، ان کی تربیت کی جائے، اس وقت خسرو کی عمر تیس برس سے زائد نہ تھی،

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے، عبید ایک شاعر جو امیر خسرو کا معاصر ہے کہتا ہے[1]،

غلط افتاد خسرو را ز خامی | که سکبا پخت در دیگ نظامی

امیر کی شاعری قدرتی تھی، وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے، ان کے باپ دادا، شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے، بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے

[1] بدایونی جلد اول ص ۲۲۲ و ۲۲۳،

تھے، تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ اُن کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے، دیباچۂ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

دراں صغرِ سن کہ دنداں می۔ - - - - افتاد، سخن می گفتم وگوہراز دہانم میریخت،

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

چوں مرا استادے سر آمدہ بر سر نیامدہ بود کہ بر سر دقائق دال شدے و آہوے مشکبار قلم را از سواد خطا باز آوردے ''

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے، استاد کے بجاے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھکر ان کا تتبع کرتے تھے، جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے، اسی انداز پر کہنا شروع کرتے، خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا، اس کے الفاظ حل کئے، لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اس کا تتبع نہ ہوسکا، پہلا دیوان بالکل بے اصلاحی ہے، امیر اس کو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہوگئے،

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے، ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے، شہاب کی پہلے نہایت تعریف کی ہے پھر لکھتے ہیں،

من بدو عرضہ کردہ نامۂ خویش	او بہ اصلاح راندہ خامۂ خویش
دید ہر نکتہ را رقم بہ رقم	رنج بر خود نہادہ و منت ہم
نظرے تیز کردہ موے شگاف	نے بہ عمیا نظارۂ بگذاف
ایں دقائق کہ شد ز مغزش پوست	موبمو شعر بیز کردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا از وے	مسِ من گشتہ کیمیا از وے

هرچه او گفت من نہادم گوش | برکشیدم مگس ز شربت نوش
وانچہ بنود و من نہ جستم پے | عیبِ آں بر من است نہ بر وے
یارب او چوں ز پنج نامۂ من | برد بیروں خطاے خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد | در قیامت خط امانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر نرے مقلد نہ تھے، جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی، وہاں استاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے، گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے، ع عیب آں بر من است نہ بر وے

کیا عجیب بات ہے وہ استاد جس کے دامنِ تربیت میں خسرو جیسا شخص پل کر بڑا ہو، آج اُس کا نام و نشان تک معلوم نہیں،

معاصر استادوں کے علاوہ خسرو نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے، وہ ان کے کلام کو سامنے رکھ کر کہتے تھے اور اُسی طرح اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے شاعری سیکھتا ہے، اسی بنا پر لیلی مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں،

زندہ است بہ معنی اوستادم | در نیست منش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں،

خسرو سرمست اندر ساغرِ معنی بریخت | شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ خسرو جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے، چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوے یہ شعر کہا،

کوکبۂ خسر ویم شد بلند　　زلزلہ در گور نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی، اور خسرو کی طرف بڑھی خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا نام لیا، دفعۃً ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے آستین تلوار کے سامنے کر دی، تلوار آستین کو کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی، یہ واقعہ جس قدر عقل کے خلاف ہے اسی قدر تاریخ کے بھی مخالف ہے، خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے، اس وقت ان کی عمر ۴۴ برس کی ہو چکی تھی یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے، شباب کے زمانہ میں اُنھوں نے غرۃ الکمال مرتب کی ہے، اُس کے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں نظامی کا پیرو اور شاگرد ہوں،

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی، اُس میں لکھتے ہیں،

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر　　وز درِ او سر بسر آفاق پر

پختہ از و شد چو معانی تمام　　خام بود پختن سودائے خام

بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست　　دیں رہ باریک بہ پای تو نیست

کالبدی داری و جاں اندر دست　　ہر چہ تو دانی بہ ازاں اندر دست

تا بود ایں سکہ بہ عالم درست　　بر تن تو کے بود ایں شقہ چست

مثنوی او راست ثنائے بگوے　　بشنوش از دور و دعائے بگوے

ایں ہمہ ز انصاف نگر زور نیست　　گر تو نہ بینی دگرے کور نیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں،

زندہ است بہ معنی استادم　　در نیست نقش حیات دادم

غرض امیر نے کبھی اساتذہ کی استادی سے انکار نہیں کیا وہ تمام استادوں کا

نہایت ادب کرتے تھے، مطلع الانوار میں جو کہدیا ہے، وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا
جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی،

امیر کے حالات شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ ان کا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزادانہ رائے نہیں دے سکتا، قران السعدین میں اُنھوں نے کیقباد اور بغرا خاں کا حال لکھا ہے لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہوجاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے، اور کلام نہایت بے ربط ہوجاتا ہے،
اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں،

وصف بر آں گونہ فرو راندہ ام	کز غرض قصہ فرو ماندہ ام
عیب چناں نیست کہ بنہفتہ ام	کانچہ بگویند ہمہ گفتہ ام
چوں منم اندر قلب کان خویش	معترف عجز بہ نقصانِ خویش
عیب یکے نیست کہ جویند باز	چوں ہمہ عیب است چگویند باز

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعر کی تین قسمیں ہیں،
استاد تمام، جو کسی طرز خاص کا موجد ہو، جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر، نظامی،
استاد نیم تمام، خود کسی طرز خاص کا موجد نہیں، لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہو، اور اس میں کمال بہم پہنچایا ہے،
سارق، جو اوروں کے مضامین چراتا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ استادی کی چار شرطیں ہیں
طرز خاص کا موجد ہو، اس کا کلام شعرا کے انداز پر ہو، صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو، غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو،

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ میں درحقیقت استاد نہیں، اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں، یعنی میں سرقہ نہیں کرتا، اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں، لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں، اول تو میں کسی طرز خاص کا موجد نہیں، دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا، خود ان کے الفاظ یہ ہیں،

بندۂ ازاں چہار شرط استادی کہ گفتہ شد، اول شرطے کہ ملک طرز است بر حکم ماجرائے کہ در مجرائے قلم جریاں یافت، کہ چندیں استادر امتابع کلمات بودہ ام،

چوں پس رو طرز ہر سوادم پس شاگردم نہ اوستادم

و شرط دوم آنکہ در نافۂ سواد، بوی خطانہ باشد ازاں نیز نتوانم زد کہ نظم بندہ اگرچہ بیشتر رواں است، اما جابجا در غزل و نغز لغزیدنی ہم است، دریں دو شرط معترفم کہ از لاف اُستادی قرعہ بر فال نتوانم غلطاند!

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے،

امیر کے کلام پر ریویو کرنے کے لئے اس سے زیادہ بڑھ کر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے،

امیر نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اصنافِ سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو ہیں،

تفصیل اس کی یہ ہے،

غزل سعدی

مثنوی نظامی

مواعظ و حکم سنائی و خاقانی،

قصائد رضی الدین نیشاپوری و کمال اسمٰعیل خلاق المعانی،

لیکن لغزشیں کون بتائے؟ یہ کس کا منھ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قرآن السعدین و اعجاز خسروی کا) لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہنچ گئی ہے، اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے،

امیر نے شعر و شاعری کے متعلق دیوانوں کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح ہے، فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے، اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں،

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی کمی بیشی کی برداشت نہیں کر سکتے،

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے متعدد مترادف الفاظ ہیں، اسلئے شاعری آسان ہے، ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا، تو دوسرا موجود ہی بخلاف اس کے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں، باوجود اس کے فارسی شعرا پر میدانِ شاعری تنگ نہیں،

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے، ردیف نہیں،

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے، وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں، لفظوں کی یہ مہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا، اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے، ردیف کی سرے سے ضرورت نہیں، نرے قافیہ پر مدار ہے، جس قدر قافیے ملتے جائیں کہتے جاؤ، ان سب وسعتوں

کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی،

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا، لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کرسکتا ہے، زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے، لیکن زباندانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے، فارسی کے وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں، کہ "اور بہت سے وجوہ ہیں، لیکن میں اس لئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے"،

امیر خسرو فن شاعری میں، جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں، خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی و نظامی، مثنوی میں، انوری، و رکمال قصائد میں سعدی اور حافظ غزل میں، یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں، تو پھیکے پڑ جاتے ہیں، بخلاف اس کے امیر، قصائد، مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں، مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں ہوا، غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں، قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی، لیکن کلام موجود ہے، مقابلہ کرکے دیکھ لو، کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں، تفصیل اس کی آگے آتی ہے،

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں لکھی گئیں، مثلاً قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جام، خاص خاص میووں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں جن سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، امیر خسرو نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کردیا ہے، انھوں نے قران السعدین

میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں، اور اس کتاب سے اُن کا بڑا مقصد اسی قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

بود در اندیشۂ من چند گاہ ۔۔۔ کز دلِ دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آیش دہم ۔۔۔ مجمع اوصاف خطابش دہم
طرزِ سخن را روشِ نو دہم ۔۔۔ سکہ ایں ملک بہ خسرو دہم
سکۂ خود زیں فنِ اندیشہ زائے ۔۔۔ تا نہ نشانم نہ نشینم زپائے
وصفِ نہ زاں گونہ شد از دل برون ۔۔۔ کاں دگرے را بدل آید کہ چون

اس قسم کی شاعری کا نام امیر نے وصف نگاری رکھا اور یہ نہایت موزوں نام ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا، بلکہ تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھایا ہے، تاہم جس قدر ہے، غنیمت ہے،

کاغذ کی تعریف

کاغذ شامی[۱] نسب و صبح دام ۔۔۔ آنکہ شد آرایش صبحش ز شام
سادہ حریرے و اصلش زخویش ۔۔۔ با قصب[۲] خز شدہ پیوند خویش
تا بے حریر آمدہ اندر نورد ۔۔۔ طرفہ حریرے کہ تواں جز نوکرد
آمدہ اجزاش فراہم ز آبے ۔۔۔ لیک پراگندگیش ہم ز آب
بسکہ شد از کوبش بسیار پست ۔۔۔ پشت دوتا گردش از یک شکست
گہ بود از دستہ تیغش گزر ۔۔۔ گہ دہد از تیغ بہ مقراض سر

---

[۱] معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا [۲] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سیال بنا لیتے تھے پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا،

گہ خلۂ سوزن مسطر کشد
گہ کشش رشتۂ دفتر کشد

حرف بحرف از قلم آرد سخن
لیک بہ پیچد ہمہ بر خویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں، ہم نے قلم انداز کر دیئے،

کشتی کی تعریف

ساختہ از حکمت کار آگہاں
خانۂ گردندہ بہ گرد جہاں

نادرۂ حکم خدائے حکیم
خانہ رواں، خانگیانش مقیم

اہل سفر را ہمہ بروے گذر
ہمرہ او ساکن و او در سفر

جاریۂ ہند زبانش سلیم
حامل چندیں بچہ، لیکن عقیم

بیشتر از مرغ پرد در کشاد
بیشتر از باد رود، روز باد

رفتہ دو منزل بہ دمے، بل دو چند
با رسن و سلسلۂ و تختہ بند

ہمچو کلنگاں بہ ہوا سر فراز
پرچو حواصل زدہ و سو کردہ باز

ہر طرفش رہ بہ شتاب دگر
ہر قدمش بر سر آب دگر

گرچہ بدریا گذرد بیش و کم
آب نیاشد مگرش تا شکم

دست چو در آب فراز افگند
آب بدست آرد و باز افگند

لطمہ زدہ بر رخِ دریا بہ زور
آب ازاں لطمہ بہ فریاد و شور

دررہ بے آب نداند شدن
کیست کہ بے آب تواند شدن

(۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے، لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدماء کے قلم سے نکل گئیں ان کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں،

امیر نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں، چنانچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

"تشبیہات نو بسیار است این مجمل جملہ را تحمل نتواند کرد، ما دو سہ نظیر برائے

یاد کردن گردشدہ"

اس کے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں،

ز انتظار دو ماہی ساق تو صد چشم | بزیر مہر ہو دارم چو دام ماہی گیر

مژہ ہائے کژ دل آویزت | کژ ہائے دکان قصاب است

زہے خرامش آں نازنیں بہ عیاری | کبوترے بہ نشاط آمدست پنداری

امیر چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے، اس لئے تشبیہات میں ان کو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی، اخیر شعر غالباً اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے، فارسی شعرا معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے، ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہ ہے، لیکن کبوتر مستی کی حالت میں جس طرح چلتا ہے، وہ مستانہ خرام کی سب سے اچھی تصویر ہے،

قصیدہ، مثنوی، غزل میں اُنھوں نے جو جدتیں پیدا کیں، اُن کی تفصیل علیحدہ عنوانوں میں آگے آتی ہے،

مثنوی | مثنوی میں جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، نظامی کے پیرو ہیں، نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں، رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ، خسرو نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے، اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے،

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص ان کے سوانح نگار کا کام ہے، البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے،

قرانِ السعدین یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۶ ۳ برس کی عمر میں لکھی، اس لئے اس میں تکلف اور آورد بہت ہے، لیکن باوجود اس کے اکثر جگہ نہایت بلند، رواں اور برجستہ ہے، مثنوی کا قصہ نہایت بیہودہ تھا، یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط وکتابت اور حملہ کی تیاری، بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحبِ تخت تھا اور اسی کی فرمائش سے یہ مثنوی لکھی گئی، بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی گستاخیاں جن کو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا مفصل اور آب ورنگ کے ساتھ لکھی جائیں، اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے، تختِ سلطنت کا مستحق بیٹا ہے، اس جھوٹی منطق کو امیر نے جہانتک ہوسکا، خوب بناہا ہے، چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں،

گر بہ گہر تاج ستانِ توام — عیب مکن گو ہر کانِ توام
ور ہوس تاج ترا در سر است — من گہرم تاج مرا در خور است
چوں سرم از تخت سرافراز گشت — تاجِ تو بر تارکِ من باز گشت
تخت جہاں بہر تو برپاے کرد — لیک بر آں تخت مرا جاے کرد
ملک بہ میراث نیابد کسے — تا نزند تیغ دو دستی بسے
از تو اگر نام پدر روشن است — خطبۂ جد بیں کہ بنامِ من است
ہر دو جوانیم من وبخت من — یا دو جواں پنجہ بہم در مزن
گرچہ برویت نہ کشم در ستیز — از پئے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کین آورم — شیر فلک را بزمیں آورم
جز تو کسے گر دم ازیں در زدے — سر زنش تیغ منش سر زدے
لیک توئی چوں پدرِ ایں سریر — من ندہم گر تو توانی بگیر

باپ نے جو جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح حرف حرف، پدرانہ محبت کے نشے سے چور ہے؛

اے ز نسب گشتہ سرِ آسریر | وز پسری ہمچو پدر بے نظیر
گرچہ غبار است ز کار توام | سرمۂ چشم است غبار توام
تا تو نہ دانی کہ دریں گفتگوے | از پے ملک است مرا گفتگوے
گرچہ توانم ز تو ایں پایہ برد | از تو ستانم بکہ خواہم سپرد
شکر کہ شد زندہ در ایام تو | من ز تو و نامِ من از نامِ تو
باش بکامم کہ بہ کام توام | زندہ و تا زندہ بنامِ توام
خواہمت از جان کہ بپا ہے مرا | در تو بخواہی و نخواہی مرا
جز بہ تمناے تو سودام نیست | بہتر ازیں ہیچ تمنام نیست
گرچہ کہ سلطان جہانم بہ ملک | تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو دورم ز تو اے نیک بخت | نے خوشم از تاج و نہ شادم ز تخت
بخت من ار پاے بر افلاک سود | با تو چو یک دم نہ نشینم چہ سود

ان خارا گداز الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا، اب اس کا لہجہ بدل جاتا ہے، اور فرزندانہ جوش محبت میں کہتا ہے؛

من کہ گلے رستۂ باغِ توام | پرتوے از نورِ چراغِ توام
گر ہمہ بر ماہ رسد افسرم | ہم بہ تہ پاے تو باشد سرم
زاید و خود کن تو اشارت بہ چیں | من سرِ خاقاں فگنم بر زمیں
تاج ز من، سر ز تو افراختن | عاج ز تو، تخت ز من ساختن
در بہ ملاقات رہی برائے تست | افسرِ من خدمتِ پاے تست

نیست مرا آں محل و آں شکوہ | کز سر خود سایہ فشانم بہ کوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا، باپ کو دیکھ کر بے اختیار تخت سے اترا اور باپ کی طرف بڑھا، باپ نے چھاتی سے لگا لیا، دیر تک دونوں جوشِ محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے، پھر بیٹے نے باپ کو لیجا کر تخت پر بٹھایا،

گرم فرو جست ز تخت بلند | کرد بہ آغوش تنِ ارجمند

داشت بہ آغوش خودش تا بدیر | سیر نہ شد چوں شود از عمر سیر

با خودش از فرش بہ اورنگ برد | تختِ کیاں بازکیاں را سپرد

گاہ زدید بہ نثارش گرفت | گاہ دوبارہ بہ کنارش گرفت

گاہ نظر بر رخ زیباش کرد | گاہ دل از مہر شکیباش کرد

پرسش از اندازہ زغایت گذشت | حد نوازش ز عنایت گذشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائفِ نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں، اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا،

خمسہ | خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں، یعنی مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینۂ سکندری ہشت بہشت،

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں، یہی ان کی تصنیف کی ترتیب ہے، چنانچہ امیر نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے، ان پانچوں کتاب کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے! اور یہ قادر الکلامی اور پرگوئی کا

حیرت انگیز اعجاز ہے،

اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے، ان میں نسبۃً امیر کا خمسہ سب سے بہتر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض، نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں، مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینۂ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر کے دل میں بھی بے اطمینانی تھی، آئینۂ اسکندری میں لکھتے ہیں،

دگر بازگیری تو پیوند خویش　　مرا خود عزیز است فرزند خویش

سزد گرچہ آواز خر خندہ را　　بود ارغنون گوش خربندہ را

بود باد بخشایشش دادگر　　کہ بر من بہ بخشش گمارد نظر

ہنر جوی و در عیب جوئی مکوش　　ترا نیز عیبے است بر خود بپوش

نظامی کے پرزور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں اُن کی زورِ طبع کا یہ نمونہ ہے،

بہ گردوں شد از نای زریں خروش　　بہ دریاے لشکر در افتاد جوش

ہزاہز در آمد بہ ہر دو سپاہ　　روارو در آمد بہ خورشید و ماہ

علم سر ز عیوق برتر کشید　　سناں چشم سیارہ بر سر کشید

بیاباں ہمہ بیشۂ شیر گشت　　جہانے پُر از شیر و شمشیر گشت

غبار زمیں کلہ [پردہ] بہ ماہ بست　　نفس را درونِ گلو راہ بست

چناں گشت روی ہوا گردناک　　کہ سیارہ گم کرد خود را بہ خاک

سپاہ از زرہ موج زن تا بہ اوج　　چو دریا کہ بادش در آرد بہ موج

بدریاے آہن جہاں گشتہ غرق　　ہوا پُر ز تیغ و زمیں پُر ز برق

زبانگِ هیونانِ گیتی نورد | شده پُر صدا گنبد لاجورد
عرق کردنِ توسناں در شتاب | ز دریای آتش برانگیخت آب
شراره که زد نعل هنگام رو | ستاره بردن ریخت از ماه نو
نفیرِ زه از چاشنی کمان | شده چاشنی بخش جانِ ہرزماں
گره برگره دشت پیکاں نہ ناں | زره بر زره پشت روئیں تناں
بزیر سپر تیغ رخشاں زتاب | چناں کز تہ برگ نیلوفر آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں، مثنوی امیر کا اصلی مذاق نہیں، سلطان کی فرمائش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے، اور گویا بیگار ٹالتے تھے، چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے، اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے،

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی، لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا، اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی، میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے، تب روٹی ملتی ہے،

مسکین من مستمند بیہوش | از سوختگی چو دیگ در جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشہ غم نگیرم آرام
باشم زبرای نفس خود رای | پیش چو خودے ستادہ بر پای
تا خون نہ رود ز پای تا سر | دستم نشود ز آب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب اُن کے خاص مذاق کی ہے یعنی لیلیٰ مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی اُنھوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے

می داد چو نظم نامہ را پیچ | باقی نگذاشت بہر ما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کی لیلیٰ مجنوں اور نظامی کی لیلیٰ مجنوں میں اگر کچھ فرق ہے تو اس قدر نازک ہے کہ خود ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں،

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کئے ہیں، اور ان کا کمال دکھلایا ہے مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھاتے ہیں،

آتش زدہ گشتہ کوہ و کان ہم | تفسید زمین و آسمان ہم
جاے نہ کہ دیدہ را برد خواب | ابرے نہ کہ تشنہ را دہد آب
مرغان چمن خزیدہ را شاخ | در رفتہ چرندگان بہ سوراخ
ریگ از تف پختہ در گرانی | چون تابہ روز میہمانی
از گرمی ریگہاے گرداں | پر آبلہ پاے رہ نورداں

عشق و محبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھکر کون سا موقع مل سکتا تھا، اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پرُدرد غزل ہے، سگ لیلیٰ کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعرا نے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے، امیر خسرو نے اس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے، مجنوں کتے سے خطاب کرتا ہے،

ہستیم من و تو ہر دو شب گرد | لیکن تو بنالہ و من از درد
چوں باز گذر کنی دراں کوے | بر خاک درش زمن نہی روے
ہر خس کہ بروگذاشت گامے | از من برسانیش سلامے
ہر جا کہ نہاد پاے روشن | زنہار ضرور بہ بوسی از لب من
خواہد چو ترا درون دہلیز | یادش دہی از سگ نہ گریز

زنجیر خود ت نہد چو بر دوش	از گردن من مکن فراموش

اس پیرایہ ادا کو دیکھو، کہتے ہیں کہ جب لیلیٰ تجھکو ڈیوڑھی کے اندر بلائے تو ایک اور سگ در کو یاد دلا دینا جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھنا میری گردن کو بھول جانا عاشق کا پیغام وسلام سب لکھتے ہیں لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہی اور کیونکر لکھتا ہی نہایت نازک مقام ہے، دیکھو امیر خسرو اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں لیلیٰ مجنوں کو لکھتی ہے،

اے عاشق دور ماده چونی	وے شمع ز نور ماده چونی
روزت دانم کہ شب نشان است	شبہاے سیاه بر چہ سان است
از من یکے می بری حکایت	با خود زکہ می کنی شکایت
در گوش کہ ؟ نالہ می رسانی	دریاے کہ قطره می فشانی
بازار تو در کدام سوی است	سیلاب تو در کدام جوی است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور درد دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا، اب اس کی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے ؟ کس سے درد دل کہتا ہے، کس کے آگے میرا نام لیتا ہے، یہ باتیں تو رازداری اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں، ان سچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہی آئینہ سکندری پھیکی ہے لیکن اس کتاب میں بھی ان کے مذاق کا جو میدان آتا ہی اس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں، نظامی نے سکندر اور بت چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب و تاب سے لکھا ہے، خاص اس موقع پر خوب زور طبع دکھایا ہی، جہاں وہ دلربا سکندر کی ایک ایک بات پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے،

خسرو نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے، اور اسی طرح بت چینی کا فخریہ لکھا ہے، نظامی کے فخریہ سے ملا کر دیکھو معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے،

مشعبد کہ داند جہاں سوختن ‌ ‌ ‌ زمن بایدش بازی آموختن
ہمہ خونِ خوبان کشم می خورم ‌ ‌ ‌ دے نوش بادم کہ خوش می خورم
رخِ ہر صنم ناپدید از من است ‌ ‌ ‌ صنم خانہ ہا را کلید از من است
سپہر آفتاب زمین خواندم ‌ ‌ ‌ دگر ماہ بیند ہمیں خواندم
سکندر کہ کرد آب حیواں ہوس ‌ ‌ ‌ نظیر نقش بود مقصود و بس
گر او ہست کیخسرو جام جوے ‌ ‌ ‌ مرا جامِ گیتی نمای است روے
گر از مجلس او سمن می دمد ‌ ‌ ‌ مرا لالہ و گل، ز تن می دمد
گر او راست بر تخت پائے نشست ‌ ‌ ‌ مرا در دلِ اوست جائے نشست
گر او تاج خواہد ز شاہاں خراج ‌ ‌ ‌ من از سروراں سرستانم نہ تاج
گر اقبال و دولت در آیا ورند ‌ ‌ ‌ مرا ہر دو چوں کمتریں چاکراند
گر او دشمناں را بہ خوں خوردن است ‌ ‌ ‌ مرا خونِ صد دوست در گردن است
گر او در ایک آئینہ بر کف نشست ‌ ‌ ‌ دو آئینہ دارم من از پشت دست
کمان وے ار صد شکار افگند ‌ ‌ ‌ یک ابروے من صد ہزار افگند
کمند وے ار صید بند و مدام ‌ ‌ ‌ من آنم کہ صیاد گیرم بدام
گر او را کلاہ است بر آسماں ‌ ‌ ‌ مرا صد کلاہ است بر آستاں

ہشت بہشت | یہ سب سے آخری مثنوی ہے اور امیر کی شاعری اُس میں پختگی اور پرکاری

کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے، خاص جو بات اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے، ساری کتاب میں فرضی حکایتیں لکھی ہیں لیکن التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا جائے، اس کے نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات جن کے ادا کرنے سے زبان قاصر ہو جاتی ہے ادا کئے جائیں، تمام کتاب کا یہی انداز ہے، اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی،

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا، اس کو بادشاہ نے ایک جرم کی بنا پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا، حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی، حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا، جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے منھ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دیدے، اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے، چیونٹی تار کو لئے ہوئے اوپر بڑھتی چلی گئی، حسن کے قریب پہونچی تو حسن نے تار کو لے کر اس سے رسی بٹی، اور پھر ایک خاص تدبیر سے اُسی کے سہارے نیچے اترا، تمام قصہ بہت لمبا ہے ابتدا کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں،

چون نگہ کرد خواجہ از بالا	کہ زنش در رسید با کالا
دادش آواز گفت بر سر تار	پارۂ قند کن بزودی یار
دہ بہ مورے کہ می رود بہ میل (لاٹ)	تا ببالاش می رود تعجیل
رشتہ را زود زود می کن باز	کز نشیب آورد بہ سوے فراز
ہمچنان کرد زن کہ او فرمود	داد رشتہ بہ مور و مور ربود
راند بالاے میل تار کشان	رسن فتنہ بہ حصار کشان
چون بہ نزدیک سار خستہ رفت بزود	ریسمان را ربود خواجہ زود

قصائد | قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے، کمال اسمٰعیل، خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں اور جس کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں، اس کا تتبع کرتے ہیں، خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے،

مجلس دو آتش دادہ، برایں از شجر ان زجر | ایں کرد منقل را مقرداں جام را جا داشتہ

اس کے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے، وہی انداز، وہی ترکیبیں، وہی استعارے ہیں، اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے، اس لئے ۷۰ شعر کہہ کر دم لیا ہے، اس میں بھی واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے، عید کا بیان کیا ہے اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے،

ہر سو جوانان در لباس ہر سو عروساں در قصب | طفلاں نہ خفتہ از طرب دیدہ بہ فردا داشتہ

از شیر و خرما مرد و زن در شیر خواری تن بہ تن | چوں شیر خواراں در دہن پستان خرما داشتہ

خورشید چوں سر برزدہ، ہر کس بہ اسپے در شدہ | ایں رو بہ سوی می کدہ، او در مصلا داشتہ

فاسق کہ می ناخوردہ گہ، در عیدگہ بیہودہ رہ | سر بر بساط سجدہ گہ، دل سوی صہبا داشتہ

داروی معلول است می بل جان مجلول است مے | خورشید مخزول است می، قرطاس مینا داشتہ

ان کے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے ان کو پسند نہیں، صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں، اس لئے قصیدہ میں اور اور مضامین کو لیتے ہیں، اور ان میں زور طبع دکھاتے ہیں، مثلاً بہار کا سماں برسات کی رُت، صبح و شام کی کیفیت، ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سب کچھ کہہ دیا ہے،

ابر بارید و ہمہ روی زمیں تر کرد | خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر برکرد

سپیدہ دم کہ صبا گشت بوستاں فرمود | بساط خاک زدیبا و پرنیاں فرمود

چو روی نازکِ گل تابِ آفتاب نداشت   زمانه بر سرش از ابر، سایه بان فرمود

ز لاله خواست چمن ساغر و سبک بخشید   ز ابر خواست زمین شربت و روانش[۱] فرمود

هر آنچه در ورقِ خویش، غنچه مشکل داشت   بنفشه گوش نهاد و صبا بیان فرمود

صبح کا سماں

سپیده دم که فلک روشنی به گیهان داد   نسیم، غالیه در دامن گلستان داد

چو چرخ پیر به رخ ز سپیدی و سُرخی   بدستش آئینه داد آفتابِ خندان داد

درست مغربی آفتاب را که فلک   نهاد زیر زمین با مداد تابان داد

ستاره را ز چه شد دیده خیره از خورشید   چو شب ز حقهٔ میناش سرمه چندان داد

غلام باد صبا ام که بامداد و پگاه   صلای عیش به عشرت سرای مستان داد

باغ | نو بهارست و چمن جلوه چو حورا کرده   ابرها ریخته لؤلؤ لا لا کرده

گره طرهٔ سنبل که صبا باز شده   دامن لاله پر از عنبر سارا کرده

برگل و لاله چنان میرود آنگه قمری   پای آلوده به خون پاچه بالا کرده

عاشقان رفته به گلزار و دل سوخته را   به تکلف ز گل و لاله شکیبا کرده

نو بهار امسال ما را روزه فرماید همی   گل چنان تر دامن از می لب بپالاید همی

بر دهان غنچه گه گه می زند بوسه نسیم   کان شکر لب جز به بوسه روزه نگشاید همی

باد در کهسار جام لاله را بر سنگ زد   گل به خنده گفت، آری این چنین باید همی

نرگس رعنا قدح بر دست و چشم اندر هوا   گوئیا میخواره ماه عید را پاید همی

گویا شراب خوار ماہ عید کو ڈھونڈھتا ہے

---

۱ روان فرمودن، فوراً حاضر کرنا،

ہوائے خرم است و ہر طرف باراں ہمی بارد (برسات) نگویم قطرہ کز بالا گلِ ریحاں ہمی بارد

نگوں سر، شاخہای سبز گوئی وہمی چیند زمیں کابر دُرافشاں لولوی غلطاں ہمی بارد

یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے

ہیں یہ ان کے رولنے کو جھکی ہیں،

چکاں قطرہ ز سرہاے انار تر تو پنداری کہ ہر دانہ کہ بودہ است اندرو پنہاں ہمی بارد

خوش آں وقتے کہ مطرب در سماع نیکواں سرخوش خراماں درمیان سبزہ و بالاں ہمی بارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت و اخلاق میں ہیں، ان میں بحر الابرار جو بڑا سیر حاصل قصیدہ

ہے مشہور ہے، التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں دعویٰ اور اس کے ساتھ دلیل ہو،

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش در دسر است ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است

عاشقی رنج است و مرداں را بسینہ راحت است سلسلہ بند است و شیراں را بہ گردن زیور است

یعنی عاشقی میں گو تکلف ہی، لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہے، جس طرح شیر زنجیر

میں بندھا ہوتا ہے اور یہی زنجیر اس کا زیور ہے،

مرد پنہاں در گلیمے بادشاہے عالم است تیغ خفتہ در نیامے پاسبانِ کشور است

راہرو چوں در ریا کوشد مرید شہوت است بیوہ زن چوں رخ بیارائید بہ بند شوہر است

نفس خاک تست ہر گہ نور بالا بر تو تافت سایہ زیر پا شود ہر گہ کہ بر تاک خور است

کار ایں جا کن کہ تشویش است در محشر بسے آب زیں جا بر کہ در دریا بسے شور و شر است

ناکسی کس ہر کہ حرص مال دارد دوزخی است عود و سرگیں ہر چہ در آتش فتد خاکستر است

اے برادر مادر و ہر ار خورد خونت مرنج چوں ترا خونِ برادر بہ ز شیر مادر است

دہر خاکے را نمونہ می کند کیں مردم است بحر آبے را غلولہ می کند کیں گوہر است

اہل سخن کے نزدیک قصیدہ میں شاعر کی جدتِ طبع کا اندازہ مخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے، اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں، انکے مخالص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں،

برسات کے ذکر کے بعد

برآمد ابر در بخشش و گرزاں پایہ در غلطد ‏ ‏ نگیرد ہیچ کس دستش مگر شاہ جہاں گیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل ار کم عمر شد گو باش دانی ‏ ‏ کہ در خور کیست عمر جاوداں را

نہالِ باغ شاہی رکن حق آنکہ ‏ ‏ ز بزم اوست رونق بوستاں را

کشادہ چہرہ کہ ماہے شدم بروزِ بین ‏ ‏ در ملک بنمودم کہ آسماں این است

طلوع صبح کا بیان کرکے،

صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست ‏ ‏ آسماں روے ملک بہ جھو نمود

ندارد روی آں نازک زگرما ہیچ آسیبے ‏ ‏ مگر در سایۂ رایاتِ شاہ کامگار آید

طلوع آفتاب کے بیان کے بعد،

خورشید جہانگیر مپندار کہ در بزم ‏ ‏ شمشیر کشیدہ ملک الشرق برآمد

قصائد میں امیر نے جس قدر جدید مضامین، لطیف استعارات، نئی نئی تشبیہیں گوناگوں اسلوب پیدا کئے اس کا احاطہ نہیں ہوسکتا، ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے، لیکن امیر اس میں بھی سب سے الگ ہیں،

بوستاں بشگفت و روی لالہ خنداں گشت باز ‏ ‏ بر رخِ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز

سبزہ خطے چند بہر خواندن بلبل نوشت ‏ ‏ بلبل آنگہ از خط خوباں غزل خواں گشت باز

خون لالہ گوئیا خواہد چکید از تیغ کوہ　　　یا چکید آں خون کہ کوہ آلودہ داماں گشت باز

غزل | اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدما رکے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی، سعدی نے غزل کو غزل بنادیا، امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانۂ سعدی کی شراب ہے، جو دوبارہ کھنچکر تیز ہو گئی ہے،

غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق، عجز و نیاز، اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے، کہ یہ جذبات اور معاملات، جس زبان میں ادا کئے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو، اس کے لئے یہ بھی ضرور ہے، کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں، جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی الجھاؤ نہ ہو، قریب الفہم خیالات ہوں، اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں، لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں، اُنھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں، اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلا دیئے، یہ سب اجمال تھا تفصیل ذیل میں ہے

بحروں کی موزونی | وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں، جن میں خواہ مخواہ بات کو صفائی، سادگی، اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے، مثلاً

سرے دارم کہ ساماں نیست او را　　　بہ دل دردے کہ درماں نیست او را

فراموش کردعمر روز را زانکہ　　　شبے دارم کہ پایاں نیست او را

براہ انتظارم ہست چشمے　　　کہ خوابے ہم پریشاں نیست او را

یار من دل ز دوستاں برداشت　　　مہر دیرینہ از میاں برداشت

درد دل او نہ کرد کارے ارچہ　　　سنگ از نالہ ام فغاں برداشت

دی بہ تندی بلند کرد ابرو — از پے کشتنم کماں برداشت

آں دوست کہ بود برگراں شد — واں صبر کہ داشتم نہاں شد

گفتم کہ اسیر گردی اے دل — دیدی کہ بہ عاقبت ہماں شد

دل بر دگرے نہم ولیکن — عاشق بہ ستم نمی تواں شد

عاشقے را چو نامہ باز کنید — نام من بر سرش طراز کنید

گر شما دین عاشقاں دارید — بعد ازیں پیش بت نماز کنید

گاہ مردن، شنیدہ ام محمود — گفت رویم سوے ایاز کنید

داد من آں بت طراز نہ داد — یا سخے نیز دل نواز نہ داد

خواب مارا بہ بست و باز نہ کرد — دل مارا بہ برد و باز نہ داد

تو چہ دانی نیاز مندی چیست — چوں خدایت بہ کس نیاز نہ داد

سوز وگداز | سوز وگداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اُٹھ رہا ہے، اس میں کبھی معشوق سے اپنا حال کہتے ہیں، کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں، کبھی خود اپنے آپ پر اُن کو رحم آتا ہے،

ماجرا اے دوست پرسیدی کہ چوں بگذشت حال — اے سرت گردم چہ می پرسی بدشواری گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیان کرتا ہے تو تھوڑا سا کہہ کر اس کو رونا آتا ہے، ٹھہر جاتا ہے، رو لیتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے، اس کی تصویر کھینچتے ہیں،

خسرو است و شب افسانہ و یار و ہر بار — قدرے گریہ و پس بر سر افسانہ رود

زانوش خسرو بزیر سر نیافت — سر نہادہ بر سر زانو بخفت

اے آشنا کہ گریہ کناں پند می دہی ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ آب از بروں مریز کہ آتش بجاں گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہئے، پھر دل پر غصہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ کمبخت جو بات ہو نہیں سکتی اس کے کہنے سے کیا فائدہ، اس مضمون کو باندھتے ہیں،

غصہ ام می کشد، اے دل سخن صبر مگوے ‌‌‌‌ وہ چرا گوئی ازاں کار کہ نتوانی کرد

حسد می بردی اے دشمن ابہ عقل و دانش خسرو ‌‌‌‌ بیا تا بر مراد خاطر خود بینی اکنونش

رنج اور غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جا سکتی، عاشق (جس کا فضل و کمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلم ہے) عاشق ہو کر تمام اوصاف کو کھو چکا ہے، وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید بر آئی، اس کو کس مؤثر طریقہ سے ادا کیا ہے،

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز ‌‌‌‌ دردہا دادی و درمانی ہنوز

گفتی اندر خواب گہ گہ روی خود بنمایمت ‌‌‌‌ ایں سخن بیگانہ را گو، کاشنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطاں زند ‌‌‌‌ ورنہ رنجے بر دل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے اور بُرا نہ مان تو فقیروں پر بھی، "ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے،

کشتم از تیغ جفایت خویش را ‌‌‌‌ بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

من کجا خسپم کہ از فریاد من ‌‌‌‌ شب نمی خسپد کسے در کوی تو

صبر طلب می کنند از دل عاشق ‌‌‌‌ ہمچو خراجے کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں، یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول

لگایا جائے،

ای دیدہ چہ ریزی از برون آب — کیں شعلہ بہ جاں گرفت مارا

ای خواب! بروکہ باز امشب — سودای فلاں گرفت مارا

ای عشق کارِ تو بہ چو من نا کسے افتاد — گویا کسے نماند جہانِ خراب را

دل ندارم غم جاناں بچہ بتوانم خورد — پیش ازیں گرچہ غمے بود وے ہم بودہ است

کس چہ داند کہ چہ رفت از غم تو دوش بہ من — از شبِ تیرہ، خبر پرس کہ محرم بودہ است

بیا بر دوستاں جاناں قضا کن — ہر آں تیرے کہ بر دشمن خطا شد

دل باز سوی آں بت بدخو چہ میرود — آں خو گرفتہ باز وراں کوچہ میرود

جاں میرود ز تن چو گرہ می زند بہ زلف — مردن مرا است از گرہ ا دچہ میرود

گر بہ بینی دل ویرانِ مرا — گوئیا ہیچ گہ آباد نبود

کافرے رخت دلم غارت کرد — شہر اسلام و مرا داد نہ بود
میرا انصاف نہ کیا گیا

کرشمہ چند کنی بر من آخر ایں جان است — نمی دمد ز زمین و صبا نمی آرد

اس مضمون پر تین سو برس کے بعد اہلی نے یوں دست درازی کی،

کرشمہ چند کنی با من آخر ایں جان است — نمی دمد ز زمیں ز آسماں نمی بارد

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم — پس از انکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جدت اسلوب | غزل کی ترقی کا فوروز لطف ادا وجدتِ اسلوب ہے، جس کے موجد شیخ سعدی ہیں، لیکن پھر وہ نقش اولین تھا، امیر کی بوقلموں طبیعت نے جدتِ اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کر دیئے، جو اگلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہے، یوں ادا کرتے ہیں،

جاں زتن بردی و درجانی ہنوز　　درد ہا دادی و درمانی ہنوز

مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایے میں ادا کرتے ہیں،

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے، اسی مضمون کو دیکھو امیر نے کس انداز سے کہا ہے،

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشم تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بے خبر ہونا، عام مضمون ہے، اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے،

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست　　او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے، اس کو یوں باز رکھتے ہیں،

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد　　مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

رخصت کے وقت معشوق کو ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا،

می روی و گریہ مے آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق،

گفتم چہ گو نہ می کشی و زندہ می کنی　　از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نہ کرد

سعدی کا شعر ہے،

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہو سکتی تھی لیکن امیر نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا،

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی | زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے،

نظر کہیں نہ لگے ان کے دست و بازو کو | یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں،

بتے و آفت تقویٰ و آخر ایں نمیدانی | کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقویٰ میں فرق آتا ہے، بجائے اس کے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے، گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں، بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے،

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

جاں زنظارہ خراب نازاو زاندازہ مشَی | ما بہ بوی مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا،

شراب لطف پر در جام میریزی و می ترسم | کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

اکثر جگہ صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کرتے ہیں،

چشم بد دور از چناں روئے | کہ از و چشم دور نتواں کرد

مردماں در من و بیہوشی من حیرانند | من در آں کس کہ ترا بیند و حیراں نشود

گفتیم ناخوشش چرائی خسرو | چوں کنم ؟ آں قد و آں بالا خوش است

گفتم کہ ہمیں ترا غلامم | گر ہست گناہ من ہمیں است

دہنت ذرۂ کم از ذرہ است | رخ ز خورشید ذرۂ کم نیست

ایہام یعنی ذومعنیین الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں،

زبانِ شوخِ من ترکی و من ترکی نمیدانم — چه خوش بودی اگر بودی زبانش در دہانِ من

پیش ازیں بر خودم یقینے بود — که دلم هیچ دلستاں نبرد

ق

تو به بردی همه یقین مرا — به طریقے که کس گماں نبرد

دی روے تو دیدم و نه مردم — شرمنده بمانده ام ز رویت

دیگر سر آں نیست که من زہد فروشم — ساقی قدحے باده که بر روی تو نوشم

اکثر جگہ جملہ معترضہ یا شرطیہ جملہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں، اور یہ ان کا خاص مذاق ہے،

برو اے باد! بوسے زن بر آں پاے — دگر چیزے نگوید بر دہاں هم

غمزهٔ تو بر صف سلطاں زند — ورنه رنجے بر دل درویش هم

رشکم آید که برم پیش تو نام دگراں — وگر انصاف بود پیش تو هم نتواں گفت

کشتیم از تیغ جفایت خویش را — بر تو آساں کردم و بر خویش هم

غمے دارم که یاد از دوستان دو — بحق دوستی کز دشمناں هم

واقعہ گوئی اور معاملہ بندی | مولوی غلام علی آزاد خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں[1]،

مخفی نماند که هنگامه آرائے سخن طرازی شیخ سعدی شیرازی که در درج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی هم دارد مثل ایں بیت

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست — تا ندانند رقیباں که تو منظور منی

امّا ناسخ نقوش مانوی امیر خسرو دہلوی که معاصر شیخ سعدی است بانی وقوع گوئی گردید

[1] خزانہ عامرہ ص۲۵،

واساس آں را بلند ساخت "

عشق وہوسبازی میں جو حالات پیش آتے ہیں، ان کے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں، اہل لکھنؤ نے اس کا نام معاملہ بندی رکھا ہے، بہر حال اس طرز کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے، امیر خسرو ہیں،

شرف قزوینی، ولی دشت بیاضی اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی کی حد تک پہنچا دیا، آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کئے ہیں،

خوش آں زماں کہ بہ پیش نظر نہفتہ کنم　　　چو سوی من نگر داو، نظر بگر دانم

غلام آں نفسم کا مدم بچو خانۂ او　　　بہ خشم گفت کہ از در کشید بیرونش

چو رفتم بر درش بسیار، درباں گفت ایں مسکیں　　　گرفتار است شاید کیں طرف بسیار می آید

امیر خسرو کے کلام کی زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے نادک و لطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کئے ہیں،

چند گویند کہ گہ گہ بہ ولش می گذری　　　ایں حدیثے است کہ بہر دل ما نیز کنند

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو؟ تم کو وہ کبھی یاد کرتا ہے، لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لئے بھی کہہ دیا کرتے ہیں، اس لئے اعتبار کیونکر آئے،

جانا! اگر شبیت دہن بر دہن نہم　　　خود را بخواب ساز و مگوکیں دہان کیست

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں کبھی رات کو تیرے منھ پر منھ رکھ دوں تو اپنے آپ کو سوتا بنا لینا، یہ نہ کہنا کہ ارے یہ کس کا منھ ہے،

دل من مست بود وغصۂ دوست　　　گہے ز انجام وگہ ز آغاز می گفت

اندک اندک گہ گہے با یار بودن خوش بود　　　در مسیر گر دوم بسیار بودن ہم خوش است

تو شبینہ می نمائی بہ برکہ بودی؟ امشب | کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد
مست آں نرو تم کہ شب در کوی خویشتم دیدو گفت | گیست ایں؟ گفتند مسکینے گدائی می کند
جان باد فدات آندم کز بعد دو سہ بوسہ | گویم کہ یکے دیگر، گوئی تو کہ نتوانم
وعدہ می خواہم و در بند وفا نیم | غرض آنست کہ بارے بہ تقاضا باشم

روزمرہ اور عام بول چال | عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہو گئی ہی، جس کا نام علمی زبان ہے،

سعدی و نظامی وغیرہ کی بولنے کی زبان اگر قلمبند کی جائے تو بوستان اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی، بلکہ آج اگر اس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہم کو سمجھنے میں وقت ہو گی، لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہی، بے شبہہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں، جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کے لئے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کی جائے، خصوصاً غزل کی زبان، روزمرہ اور عام بول چال ہونی چاہئے، کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے،

قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دیجائے، سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے، اس کا ایک بڑا گر یہی ہے،

امیر خسرو کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں، اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے

بھی آجاتے ہیں جو آج ہم کو اس لئے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہم کو اس زمانہ کے روزمرہ کے محاورات سے واقفیت نہیں،

دل بسے بردۂ نکو بشناس — آں کہ مجروح تر از آں من است

یعنی تم نے بہت سے دل لئے ہیں، خوب غور کرکے دیکھو جو بہت زخمی ہو وہی میرا دل ہے

صبح روے تو بدینساں کہ برآید امروز — نیست امکاں کہ چو من خستہ تا شام کشند[۱]

لب دہان رخت ہر یکے بلاے دل اند — یکے دلم چہ کند جانب کدام شود

یعنی تیرا لب دہن، اور چہرہ، سب بلا ہیں، میرا دل کیا کرے، کدھر کدھر جائے،

گفتم ای دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی — عاقبت رفت وہماں گفتۂ من پیش آمد[۲]

خلقے براہ منتظر جاں سپردن اند — ای ترک نیم مست عناں اکشیدہ تر
ذرا باگ کو روکے ہوئے

بوسہ گفت و زباں گرداند — خود ہمے گوید و مے گرداند

بوسہ دینے کو کہا اور پلٹ گیا، آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے،

بوے خوشم آید از تو در جیب — گل داری یا ہمین است بویت

تیرے بدن سے خوشبو آرہی ہے، تیری جیب میں پھول ہے یا یہ تیری بو ہے،

خشک سالی است دریں عہد وفا لاے رتنگ — زاں حوالی کہ تو می آئی باراں چون است
جدھر سے تم آتے ہو ادھر بارش کیسی ہے

ای گل، دہن تنگت صد تنگ شکر چیزی — گل با تو نمی ماند در حسن مگر چیزے،
ذرا سا

گویم غم و درد م بیں گوئی کہ بتر خواہم — بسم اللہ اگر خواہی زیں ہر دو بتر چیزے

چو سبزہ خویش را خط تو خواند جاآں باشد — کہ گل از خندہ برخاک او فتد غنچہ شکم گیرد

یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین

---

[۱] تا شام کشند یعنی شام تک زندہ رہجائے [۲] یعنی وہی میرا کہا سامنے آیا،

پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں،

دلم می خواستی برہم عفاک اللہ چنان بیدی ‌‌ مرا می خواستی رسوا بحمد اللہ کہ آن ہم شد

اے صبادی کہ غلانے بہ چمن مے می خورد ‌‌ ہیچ یاد من گم گشتۂ زندانے کرد

از کجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم ‌‌ بوے گل نیست کہ می آیدم این بوی کسی است

دل من دور نہ رفت است نکو مے دانم ‌‌ باز جوئید ہمیں جای کہ در کوی کسی است

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم ‌‌ کہ ز ابروے تو چشم بدو محراب افتاد

تیرا چہرہ دیکھ کر مجھکو قبلہ میں دھوکا سا ہوتا ہے کیونکہ مجھکو تیرے ابروسے دو محرابیں نظر آتی ہیں،

رخ جملہ را نمود و مرا گفت تو مبیں ‌‌ زین ذوق مست و بیخبرم کان سخن چہ بود

سب کو منھ دکھلایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ میں اس مزہ میں مدہوش ہوں کہ یہ کیا بات کہدی،

ساکنان سر کوے تو نباشند بہ ہوش ‌‌ کاں زمینے است کہ آنجا ہمہ مجنوں خیزد

ز چشمت کاروانِ صبرِ من تاراج کافر شد ‌‌ مسلمانان کسے دیداست کاندر شہر راہ افتد

مسلمانو! کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہی،

بہ بازی سوے من آمد بہ شوخی دل ز من بستد ‌‌ بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار می آید

عام محاورہ بکار می آید ہے کار می آید امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گذرا،

حسن تو عالمے بخواہد سوخت ‌‌ ہم در آغاز می توان دانست

نرخ کردی بہ بوسہ جانی ‌‌ بندہ بخرید رائگان دانست

تو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی، میں نے خریدا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا،

از بہر آں کہ لاف جمالِ تو میزند ‌‌ صد بار لالہ بر دہن یاسمین زدہ است

با جان فدای خنجرِ تسلیم کردہ ایم ‌‌ خواہی بہ بخش و خواہ بکش رای رای تست

ساقی بیار می کہ چناں سوخت دل عشق کز سوز ایں کباب ہمہ خانہ بوگرفت

راست کردی زابروان محراب می نماید نماز خواہی کرد

ابروؤں سے تونے محراب درست کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے،

من آں ترکِ طنازرا می شناسم من آں مایۂ نازرا می شناسم

شنیدم تازہ شد جاں بہ دشنام مستی توبودی من آوازرا می شناسم

باد صبا چو از رخ او زلف در ربود ابر سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد

دھوپ نکل آئی

تو حال من ہم از پئے دیدی رودیرونگ کہ من بہ وی تو پیدا نمی توانم کرد

سالہا شد کہ نیابم خبر در کویت دل ویراں شدہ را آیم و آواز کنم

من از سرزندہ گردم، گر تو یارا یک سخن گوئی تو می دانم نگوئی، لیک من گفتار میگویم

مجھ کو معلوم ہے کہ تم نہ کہوگے لیکن میں بات کہتا ہوں

دعوای خوں بہای دل خویش می کنم یک بوسہ بر لبم زن و مالا کلام کن

امیر نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو ان کے سوا کسی اور اہل زبان کے کلام میں نہیں ملتے مثلاً

از گرہ او چہ می رود

آواز کردن، پکارنا،

گفتار می گویم، یوں ہی ایک بات کہتا ہوں،

مالا کلام کردن، کسی کو ساکت اور بند کرنا،

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی

لہ پیدا کردن، ظاہر کرنا،

محاورے اُن کی زبان سے نکل جاتے ہیں، ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن چونکہ ہم کو اپنے تتبع اور استقرار پر اعتماد نہیں، اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے،

تسلسل مضامین | غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے، قصائد کا موضوع مدح ہے، مثنویاں، قصے یا اخلاق کے لئے مخصوص ہیں، قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں، عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے ہوں تو کیونکر کریں، اس کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے، لیکن قدما بلکہ متاخرین میں بھی اسکا بہت کم رواج ہوا، امیر خسرو نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اُس کی نظیر نہیں مل سکتی،

مثلاً عاشق، قاصد یا اپنے رازدار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ، دیکھو کس اشتیاق، کس حسرت، کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں،

ای صبا باز بمن گوی کہ جاناں چون است	آں گل تازہ وآں غنچۂ خنداں چون است؟
باکہ مے می خورد آں ظالم و درمی خوردن	آں رخ پر خوی آں لف پریشاں چون است؟
چشم بد خوش کہ ہشیار نہ باشد مست است	چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چون است؟
روی و زلفش بت عیار کہ آں ہر دو خوش اند	دل دیوانۂ من پہلوی ایشان چون است؟
روزہا شد کہ دلم رفت دراں لف بماند	یا رب آں یوسف گم گشتہ بزندان چون است؟

پوچھتے پوچھتے دفعۃً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلافِ عاشقی ہے، اس لئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے،

ہم بجان و سر جاناں کہ کم بیش مگوے	گو ہمیں یک سخن است کہ جاناں چون است؟

یعنی معشوق کی جان کی قسم ادھر ادھر کی باتیں نہ کہہ صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے معشوق نے روزہ رکھا ہے اس پر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہو سکتے ہیں، ان کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

ماہ من روزہ میان شکرستان دارد ای خوش آن روزہ کہ جا در لب جانان دارد
لب ے آلودہ دہان پرشکر و نرگس مست ای مسلمانان کسی روزہ بدینسان دارد
خضر گر بر لبش آید تشکند روزۂ خویش کان پسر در تہ لب چشمۂ حیوان دارد
خون من می خورد آخر زنش پنہان نیست من گرفتم کہ خود او روزہ پنہان دارد
جان من گر تو قدم رنجہ کنی بندۂ تو قدرے آب دو چشم و دل بریان دارد

معشوق سروسامان کے ساتھ سوار آرہا ہے، عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے؟ یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آرہی ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں معشوق آتا ہے، لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا، اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہیے، ان خیالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں،

کہ می آید چنیں یارب نگہ سہ بر زمیں آید چہ گرد است اینکہ میخیزد کہ با جان ہمنشیں آید
کہ می راند جنیبت را کہ میداں عنبرآگیں شد (سواری) کہ این باد می جنبد کہ بوے یاسمیں آید
بتی دانت تقوی و آخر ایں میدانی کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آید

بہار آئی ہے، عاشق باغ میں جاتا ہے، مجلس آرائی کے سامان ساتھ ہیں، قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے، سبزۂ لب جو اور عالم آب کی سیر قابل دید ہے، قاصد سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ادھر ادھر کی باتوں میں نہ آنا چاہئے،

تو نہ ماننا، اور جس طرح ہو سکے ساتھ لانا، اور اگر عالم مستی میں ہو تو اسی طرح مست اٹھا لانا، ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا ہے،

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش — وقتے است خوش بہار کہ وقت بہار خوش[1]

در باغ با ترانۂ بلبل دریں ہوا — مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش

مائیم و مطربے و شرابے و محرمے — جامے بزیر سایۂ شاخِ چنار خوش

ای باد کاہلی مکن و سوے دوست رو — مارا بکن بہ آمدنِ آں نگار خوش

چیزے دگر نگوے ، ہمیں گو کہ در چمن — سبزہ خوش است و آب خوش و جوبار خوش

گر خوش کند ترا بہ حدیثے کہ باز گرد — پیشش کن و بیار مشوز ینہار خوش

در بینیش کہ مست بود خفتنش مدہ — ہم ہمچنانش مست بہ نزدِ من آر خوش

من مست خوش حریفی او یم کہ آں حریف — سرخوش خوش است و مست خوش و ہوشیار خوش

با اد وراں زماں کہ منش راہ می دہد — بازی خوش است و بوسہ خوش است و کنار خوش

سرو پیادہ خوش بود اندر چمن ولیک (طبیعت) — آں سرو من پیادہ خوش است و سوار خوش

بہار میں کیا کیا چاہئے ؟ اس کو تفصیل سے لکھتے ہیں،

ہنگام گل است بادہ باید — ساقی و حریف سادہ باید

گر غنچہ گرہ در ابرو افگند — پیشانی گل کشادہ باید

ساقی برخیز و یار بنشاں — کیں بشیشہ در آں ستادہ باید (نشستہ)

وانگاہ ، حریف سادہ و (مست) — در چنگ من افتادہ باید

بہار کا سامان،

[1] وقت کسے خوش بودن، دعائیہ جملہ ہے، یعنی خدا اُن کو خوش و خرم رکھے،

بوستاں جلوہ گرفت اینک | گل ز رخ پردہ درگرفت اینک
آتشِ لالہ برفروخت ز باد | دامنِ کوہ درگرفت اینک
بلبل آمد، نشست بر سرِ گل | بے نوا بود، زر گرفت اینک
غنچہ در پیش فاختہ ز اصولِ موسیقی | سبقے تازہ برگرفت اینک
ورق غنچہ را کہ ترشدہ بود | ورقش یکدگر گرفت اینک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ نم تھے، اس لئے چپک کر رہ گئے،

آب را گرچہ چشم ہا پاک است | بوستاں را ببر گرفت اینک

یعنی پانی گو پاک نظر ہے، تاہم اس نے باغ کو سینہ سے لپٹا لیا،

خار چوں تیز کرد پیکاں را | گل بصد تو سپر گرفت اینک
طوطیِ آغاز شعرِ خسرو کرد | روے گل در شکر گرفت اینک

جدت | جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، امیر کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں، اور یہ دعویٰ بدیہی دعوی ہے، اون کی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہ ہو، چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں،

راز خون آلود خویش اے دل منہ با من بروں | کیں ورق خام است حرف ازوے بروں خواہد گذشت

اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ، کیونکہ یہ کاغذ کچا ہے، اس میں حرف پھوٹ نکلے گا،

زلف او پہلوی خال لب او | گوئی از شہد مگس می راند
نہ رود مہ بر اوج در شب تار | تا ز زلف تو نردبان نہ برد

یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا، جبتک تیری زلفوں کی سیڑھیاں نہ لگائے

(چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہ دی ہے)

ہست صحرا چوں کف دست برد از لالہ جام　　خوش کف دستی کہ چندیں جام صہبا برگرفت

اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے،

دیدہ ام شاخ گلے بر خویش می پیچم کہ کاش　　می توانستم بیک دست ایں قدر ساغر گرفت

یعنی میں نے ایک ڈالی پھولوں سے بھری دیکھی، اور تڑپ گیا کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اتنے ہی پیالے لے سکتا،

غلام نرگس مستم کہ بامداد پگاہ　　قدح بدست گرفتہ ز خواب برخیزد

گلستاں نسیم سحر یافتہ است　　صبا غنچہ را خفتہ دریافتہ است

چناں خواب دیدہ است نرگس بخواب　　کہ گویا یکے جام زر یافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے، اس کو جام زر سے تشبیہ دیتے ہیں، اور یہ تشبیہ عام تھی، لیکن اس اسلوب بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو جام زر ہاتھ آگیا ہے، ایک خاص لطف پیدا کر دیا، اور چونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں، اس لئے خواب دیکھنے کی توجیہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے،

می روی و گریہ مے آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آئے ہیں، لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے وقت مجھکو رونا آتا ہے، اتنا ٹھہر جا کہ بارش تھم جائے، اور اس میں مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے، اس لئے وہ جانا چاہے گا، تو بارش ہوگی، اس لئے وہ کبھی نہ جا سکے گا،

می میانِ شیشۂ ساقی نگر　　آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

ابر آمد و بہ ساغرِ لالہ شراب کرد　　در گوشہائے باغ بسے در ناب کرد

فراشِ باغ بارگہ خود بہ باغ زد — وانگہ بر آب، خرگہ سیم از حباب کرد

نرگس کہ شب نخفت ز فریاد بلبلاں — بنہاد سر بہ بالش گل میل خواب کرد

مضمون آفرینی خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے، لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے، غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے، غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنے امیر خسرو کا ایجاد ہے اور انہی پر خاتمہ بھی ہو گیا، متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں، لیکن اسکا دوسرا انداز ہے، وہ اور سلسلہ کی چیز ہے، چنانچہ آگے چل کر اسکی حقیقت کھلے گی،

امیر خسرو کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں، مثالوں سے اندازہ ہوگا،

بہ خانہ تو ہمہ روز بامداد بود — کہ آفتاب نیارد شدن بلند آنجا

ترے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے، کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا،

زلف تو سیہ چراست بارا — بسیار در آفتاب گشتہ است

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم — کہ ز ابروی تو چشم بد و محراب افتاد

چشم مست تو کہ دی بر من بیتاب افتاد — تو نیفگندی از آلودگی خواب افتاد

ز ہجراں چنیں تاریک باشد خانہ چشمم — کہ ہرگز آفتاب من درین روزن نمی آید

پیش تو آفتاب نتواں جست — روز روشن چراغ نتواں کرد

می روی و گریہ می آید مرا — ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

دلِ من بہ زلف و رویت شد اسیر و چون نہ گردد — شب ماہتاب دزدے کہ بخانہ در آید

زہے عمر دراز عاشقاں گر — شب ہجراں حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشق کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے،

زلف اناں می بُرد آں شوخ کہ شبہائے غم — گر شود کوتہ ازاں جا ہمہ پیوند کنند

یعنی اپنی زلف وہ اس لئے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہو جائیں تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھادے،

راہی است برائے بردن دل — ابروی تو کز میان کشاد است

یعنی تیرے دونوں ابروؤں کے درمیان میں جو فاصلہ ہو، اسلئے ہو کہ دل لیجانے کیلئے راستہ ہو،

زلفت سر و پا شکستہ زان است — کز سرو بلندت اُفتاد است،

یک شب ز رخ خویش چراغیم کرم کن — تا قصۂ اندوہ تو ہم پیش تو خوانم

یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کرو کہ میں اسکی روشنی میں اپنا قصہ تمھارے سامنے پڑھ کر سناؤں،

خانۂ چشم من خراب شدہ است — کہ بہ بنیاد خانہ، نم رفتہ است

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی — مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شکریں لعلِ تو کان نمک است — گرچہ شکر نہ مکان نمک است

اب روے تو ملاحت افزود — گرچہ از آب زیاں نمک است

خواہی ایجان برو و خواہ بمن باش کہ من — مردنی نیستم امروز کہ جاناں اینجاست

آئینہ کرد حسن وی از آسمان سوال — برخاست آفتاب بہ زانو جواب کرد

یعنی اس کے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا، آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے،

سرابروی تو گردم گرہش باز کشائے — کہ کمانست نہ بہ اندازۂ بازی کسی است

ہر چند کہ زلفِ تو سپاہی است جہانگیر — زیں گونہ پریشاں نتواں کرد سپہ را

بہ سایہ خفتہ بدم من کہ یار آمد و گفت — چہ خفتۂ کہ رسید آفتاب در سایہ

اکثر شاعرانہ اجتماع نقیضین ثابت کرتے ہیں، اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے،

ع درد ہا دادی و درمانی ہنوز،

یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم

صنائع | امیر نے اعجاز خسروی میں صنائع و بدائع پر اس قدر ہمت صرف کی کہ ہم کو بڑا ڈر تھا کہ جو جال اُنھوں نے بچھایا اس میں خود بھی پھنس نہ جائیں لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو فن بنایا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں مثلاً فرغنی و ابن المعتز وغیرہ، وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے،

تکلف

امیر خسرو، اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں، تاہم ان کے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں، اور اس حد تک نہیں پہنچے کہ نکتہ گیری کی زد میں آئیں، صنعت طباق یعنی اضداد ان کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اس کو بڑی خوبی سے بناہتے ہیں،

ع درد ہا دادی و درمانی ہنوز

اگر تو ہمنشین بندہ باشی ز بند دو جہاں آزاد گردم

کرم کردی الٰہی زندہ باشی من درویش را کشتی بہ غمزہ

چوں کنم؟ آں شکل داں بالا خوش است گفتیم نا خوشش چرائی خسروا

ہمہ یاران بندہ را خبر است بندہ را در غمِ تو نیست خبر

اے بزرگانِ شہر داد دہید خرد سالے بہ من کند بیداد

عربیت | اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امیر کو عربی علم ادب میں کمال تھا، اور اس فن کی نادر کتابیں ان کے حافظہ میں محزون تھیں، تاہم ان کو اس فن میں دعویٰ نہیں، غرۃ الکمال کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا، کہ باوجود اعتراف عجز کے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے،

اشعار یہ ہیں

ذاب الفواد و سال من عینی الدم   وحکی الدموع کل ما انا اکتم

دل پگھل گیا، اور آنکھ سے خون بہا اور آنسوؤں نے وہ سب کہدیا جو میں چھپاتا تھا،

واذا ابحت لدی الوری کرب النوی   بتکی الاحبۃ والاعادی ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے

یا عاذل العشاق، دعنی باکیا   ان السکوت علی المحب محرم

او ناصح! تو مجھے رونے دے چپ رہنا، عاشق پر حرام ہے،

من بات مثلی فھو یدری خلیلتی   طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہی،

اعجاز خسروی میں عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں، جن سے ان کی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لغو تکلفات ہیں، لیکن یہ اس زمانہ کا عام انداز تھا، تنہا ان پر الزام نہیں آسکتا،

وان انا الا من غزیۃ، ان غوت   غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

میں بہر حال قبیلہ غزیہ کا آدمی ہوں، غزیہ گمراہ ہی تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ پر ہو تو میں بھی ہوں،

صنائع وبدائع | امیر خسرو نے صنائع وبدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں، اگرچہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ اون کی محنت بالکل رائگاں نہ جانے پائے، ان کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے،

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں، لیکن فارسی میں ان کا ادا کرنا اسلئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اس کی متحمل نہیں ہوسکتی، مثلاً صنعت منقوط یعنی عبارت

میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو، امیرؔ نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں، بعض فارسی میں تھیں لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص لکھ نہ سکا، امیر خسرو نے ورق کے ورق لکھے، بعض صنائع میں اُنھوں نے تصرفات کئے، اور بعض بالکل خاص ان کی ایجاد ہیں، چنانچہ ہم انہی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں،

دو رُو، یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ نقطوں کے رد و بدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے اور با معنی ہو، امیرؔ نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں، لیکن کاتبوں کی غلط نویسی نے ان کا صحیح پڑھنا ناممکن ہے، اس لئے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں،

رسیدی بدیدی مرا، دی بہ خانے (کل مکان) — زمانے بباشی، بہ یاری بشائی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے،

کل تو آیا اور تو نے مجھ کو ایک مکان میں دیکھا، ایک ذرا ٹھہر جا تو دوستی کرنے کے قابل ہے،

لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں،

رشید ہی، اندیدی، مرادی نجاتی — رمانی بیاس تبادی نسائی

تو میرا ہدایت یافتہ ہے، بے نظیر ہے، میری مراد ہے، میری نجات ہے، مجکو اس بات نے ناامید کیا ہے کہ میری عورتیں باہم لڑتی ہیں،

قلب اللسانین، بہت سے اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں، لیکن اگر ان کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جائے، مثلاً

بسی با کامرانی در جہاں باش،
می باش بہ کار شادمانی
بای یار ما کہ کار می کنیم بہم

دوست ما یارمنی بہ یاری مائی

بکن داد و بکشو د کامراں باش

ان تمام مصرعوں کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جاتی ہے،

وصل الحرفین یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں، ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے، بلکہ دو دو تین تین حرف کا لفظ ہو، مثلاً

چاکر خاصہ، حاجی شرقانی، سر خدمت، بر پایت می مالد، ومی گوید، کہ بدیں جانب خاطر ما با فرحت قرین می باشد باید کہ گہ گہ جانب ما، نامہ فرماید، تا ہر خوشی کہ بر ماست فرخی کامل باید،

یہ اُس صنعت کا نقیض ہے، جس کا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے، مثلاً

دُر دُور و داد آورد، در رو دار، وارای دربار ی دوار، ذات داور دوراں را، الخ

امیر نے اسی صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے،

اربعۃ الاحرف، اس صنعت پر امیر کو بہت ناز ہے، کئی کئی سطروں کی با معنی عبارت لکھی ہے، اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف، ہ، واو، ے کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے، یعنی تمام الفاظ صرف انہی حرفوں سے بنے ہیں،

لیکن جو عبارت لکھی ہے، وہ بالکل سہل معلوم ہوتی ہے اور اس کا پڑھنا سخت مشکل ہے،

معجزۃ الالسنۃ و الشفاہ، اس صنعت پر اور بھی ان کو ناز ہے، اس میں ایسے الفاظ جمع کئے ہیں کہ سطریں کی سطریں پڑھتے جاؤ، لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہو گی، صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے،

ترجمۃ اللفظ، یہ صنعت بھی خاص ان کی ایجاد ہے، اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے، اُس کے بعد کا لفظ، دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہو جاتا ہے، مثلاً

سودا سے رخ تو کشت مارا

یہ فارسی مصرع ہے لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو "مارا" ہوگا اس لئے مصرع کا اخیر لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے، امیر نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے،

محتمل المعانی، ایک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اس کے سات معنی ہیں، اور ہر معنی وہاں مراد لئے جا سکتے ہیں،

موقوف الآخر، ایک رباعی لکھی ہے، جس کا ہر قافیہ، دوسرے مصرعہ کے آغاز کا محتاج رہتا ہے، مثلاً

در حسن ترا، کسے نماند الا — خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا

خدمت کند و پای تو بوسد، اما — بینی تو ببوسے او، چو پا بوسد، تا

انہی صنعتوں اور پیچا کاوشوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں، اگر کسی صاحب کو امیر خسرو سے زیادہ مغز کاوی مقصود ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے، مطالعہ فرمائیں،

سلمان ساوجی

(وفات ۷۶۹ھ یا ۷۷۸ھ)

عراق عجم میں ساوہ ایک مشہور صوبہ تھا، صاحب آتشکدہ لکھتے ہیں کہ "اب صرف چند قصبے باقی رہ گئے ہیں" ، سلمان یہیں کے رہنے والے تھے، عربی میں نسبت کے وقت ہ ج سے بدل جاتی ہے، اس لئے ساوجی کہلاتے ہیں، ان کا خاندان ہمیشہ سے معزز چلا آتا تھا اور سلاطین وقت ان کا بہت احترام کرتے تھے، سلمان کے والد جن کا نام خواجہ علاء الدین محمد تھا، دربار شاہی میں ملازم تھے، سلمان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی حیثیت سے ہوئی تھی، چنانچہ دفتر کے کاروبار اور علم سیاق میں نہایت کمال رکھتے تھے، اس زمانہ میں جو طوائف الملوک حکومتیں جابجا قائم ہوگئی تھیں، ان میں ایک جلایر کا خاندان تھا، جس کا پایۂ تخت بغداد تھا، اس خاندان نے ۷۰ برس تک حکومت کی، اور چار شخص مسند حکومت پر بیٹھے، اس سلسلہ کا پہلا فرماں روا حسن ایلکانی تھا حسن ایلکانی کے فرزند سلطان اویس جلائر نے بڑا جاہ اور اقتدار پیدا کیا، ۷۶۰ھ میں آذربائجان، اران، موغان شیروان، موصل وغیرہ فتح کر کے، اپنے حدود حکومت میں داخل کر لیے ۱۹، ۲۰ برس تک بڑے عظمت و اقتدار کے ساتھ حکومت کی، مختلف علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا، تصویر ایسی عمدہ کھینچتا تھا کہ بڑے بڑے مصور دنگ رہ جاتے تھے، خواجہ عبدالحئی جو مشہور مصور گذرا ہے، اسی کا تربیت یافتہ تھا، علم موسیقی میں اکثر چیزیں اس کی ایجاد

ہیں ان باتوں کے سوا حسن و جمال کا یہ حال تھا کہ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو راستہ تماشائیوں سے رک جاتا تھا، ۷۷۶ھ میں وفات پائی،[1] خواجہ سلمان انہی دونوں کے دربار کے ملک الشعراء تھے،

خواجہ سلمان کی ابتدائی تقریب کا یہ واقعہ ہے، کہ انھوں نے حسن ایلکانی کی فیاضیوں کا شہرہ سن کر بغداد کا قصد کیا، اور دربار میں پہونچے، ایک دن حسن تیراندازی کی مشق کر رہا تھا، سلمان بھی اس موقع پر موجود تھے، برجستہ یہ اشعار کہہ کر پیش کئے،

چو در بار چاچی کماں رفت شاہ | تو گفتی کہ در برج قوس است ماہ
دو زاغ کماں با عقابِ سہ پر | بدیدم بیک گوشہ آوردہ سر
نہادند سر بر سرِ گوشِ شاہ | ندانم چہ گفتند در ہوشِ شاہ
چو از شست بکشادہ خسرو گرہ | برآمد ز ہر گوشہ آواز زہ،
شہا تیر در بند تدبیر تست | سعادت دواں در پی تیر تست
بہ عہدت ز کس نالۂ بر نخاست | بغیر از کماں کو بنالد رواست
کہ در عہد سلطانِ صاحبقراں | نکرد است کس زور جز بر کماں

حسن نے سلمان کی غیر معمولی قادر الکلامی دیکھ کر مقربینِ خاص میں داخل کیا،

سلطان حسن کی حرم دلشاد خاتون نہایت قابل اور لائق عورت تھی، سلطان برائے نام بادشاہ تھا، سلطنت کا نظم و نسق دلشاد خاتون کے ہاتھ میں تھا، وہ شعرائے سخن کی بڑی قدردان تھی، اس بنا پر سلمان کی نہایت قدردانی کرتی تھی، سلمان نے بھی اس کی مدح میں جی کھول کر زورِ طبع دکھایا ہے،

سلطان اویس کو شاعری کے ساتھ خاص مذاق تھا، خود شعر کہتا تھا، اور سلمان کو دکھاتا

[1] مجمع الفصحاء و تذکرۂ دولت شاہ،

تھا، اس بنا پر سلمان نے اس کے دربار میں نہایت تقرب حاصل کیا،

ایک دفعہ سلمان رات کے وقت سلطان اویس کی مجلس عیش میں شریک تھے جلسہ ختم ہو چکا تو سلمان اٹھے، سلطان نے ملازم ساتھ کر دیا، کہ روشنی دکھانے کے لئے شمع ساتھ لیجائے، گھر پر پہنچے تو ملازم شمع وہیں چھوڑ آیا، صبح کو شمع لینے گیا تو خواجہ صاحب اس بنا پر گھبرائے کہ شمع کے ساتھ طلائی تھالی بھی تھی، وہ ہات سے جاتی ہے، اسی وقت یہ شعر لکھ کر ملازم کو دیا، کہ سلطان کی خدمت میں پیش کرنا،

شمع خود سوخت بزاری شب دوش امروز　　گر لگن می طلبد شاہ زمن می سوزم

سلطان نے ہنس کر کہا کہ شاعر سے کوئی چیز کون واپس لے سکتا ہے[1]،

سلمان جب بہت ضعیف ہو گئے تو ملازمت سے استعفا دینا چاہا اور مسلسل چار قطعے لکھ کر پیش کئے،

بادشاہا! بندہ در حضرت برسم عرضداشت　　اندیں ساطے می نماید بر اُمید رحمت

قرب چل سال است تا سکان شرق و غرب　　طبع سلمان می کند در گوش در مدحت

در ثنائی حضرتت عہد جوانی گشت صرف　　نوبت پیری رسید اکنوں بامر حضرتت

گوشۂ خواہم گرفتن تا اگر عمرے بود　　چند روزے بگذرانم در دعاے دولتت

علت پیری دورم پا و ضعف جسم و چشم　　می برو در دسرمن بندہ را از خدمت

گفتہ ام در باب خود فصلے دو سہ نزا جواب　　چشم دارد بندہ از درگاہ گردوں حشمت

قطعۂ دوم

اول آنست کہ چوں نیت عزلت دارد　　بندہ زیں دائرۂ جمع، جدا خواہد بود

[1] دولت شاہ

مدتے مالکِ ملکِ شعرا بود بہ حق | زیں زماں خادمِ جمعِ فقرا خواہد بود
پیش ازیں، در پئے مخلوق بہ سر می گردید | بعد ازیں بر درِ معبود بپا خواہد بود
بندہ تا زندہ بود وجہ معاشِ بندہ | ہیچ شک نیست کز احسانِ شما خواہد بود
لیک دارم طمع آں کہ معین باشد | کہ مرا وجہ معیشت ز کجا خواہد بود

قطعۂ سوم

دیگر آن است کہ محبوبِ جہاں مفری شاہ | آمد از بندگی[1] شاہ کہ مے فرماید
رو بگو بندۂ دیرینۂ ما سلمانؔ را | کہ بخواہ از کرمم ہرچہ ترا می باید
بندہ برحسبِ اشارت طلبی کردم وشاہ | داشت مبذول جہاں کز کرمِ شاہ آید
وعدہ دیں است ودینِ من اگر زانچہ کند | ذمۂ ہمت خود شاہ بری، مے شاید

قطعۂ چہارم

دیگر از خرج ترددو (زیادہ) ونمل بکش قرضے چند | ہست و فرض است کہ قرض غربا باز دہد
بندہ را غیر در شاہ در دیگر نیست | قرض باید کہ ز انعامِ شما باز دہد
وجہ این قرض کہ از من غربا می خواہند | گر نہ خواہد نہ تو سلماں ز کجا باز دہد

سلطان نے فی البدیہہ پہلے قطعہ پر یہ شعر لکھا،

ہر چہ تا غایت بہ نام او مقرر بودہ است | ہمچناں باشد بہ نام او مقرر ہمچناں

دوسرے قطعہ پر یہ لکھا،

---

[1] بندگی کا لفظ اس زمانہ میں اس طرح بولتے تھے جس طرح آجکل بادشاہ کے لئے ہز مجسٹی کہتے ہیں،

دہ ایرین کہ در حدود دے، است   بدہندش کہ التماس وے است

غرض جاگیر اور تنخواہ کی بحالی کے ساتھ قرض بھی ادا کر دیا گیا[1]،

سلمان نے گوشہ نشینی اختیار کی اور جب تک زندہ رہے، ہر قسم کے تعلقات سے آزاد رہے، حسب روایت دولت شاہ ۷۶۹ھ میں وفات پائی، لیکن مولوی غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے دیوان سلمان کا ایک نسخہ ۷۹۱ھ کا لکھا ہوا دیکھا، اُس کے خاتمہ میں ایک قطعہ تھا، اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کہ صاحب قطعہ سلمان کا معاصر ہے، قطعہ یہ ہے،

محل آیت اعجاز پارسی، سلمان   کہ کرد ناطقہ پیش دمش بہ عجز اقرار

ندید بر سر شاخ گل سخن اصلا   بہار طبع چو او عندلیب خوش گفتار

نماز شام دو شنبہ بیاز صفر بود   کہ نقد عمر بہ یک دم چو صبح کرد نثار

بساط دار قرار ست سال تاریخش   چو کرد میل بہ سوے بساط دار قرار

اس سے ۷۷۸ھ نکلتے ہیں،

ناصر بخاری اس زمانہ میں مشہور شاعر تھے، اور درویشانہ وضع رکھتے تھے، حج کو جاتے ہوئے بغداد میں آئے، خواجہ سلمان کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی، ان کو بھی ملنے کا شوق پیدا ہوا، ایک دن سلمان دجلہ کے کنارے عالم آب کی سیر کر رہے تھے، ناصر وہیں پہنچے، سلمان نے مزاج پرسی کے بعد نام و نشان پوچھا، ناصر نے کہا شاعر ہوں، سلمان نے فی البدیہہ یہ مصرع پڑھا،

ع   دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ ایست

ناصر نے برجستہ دوسرا مصرع پڑھا،

ع   پاے در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ ایست[2]

---

[1] یہ تمام تفصیل خزانہ عامرہ میں ہے، [2] دولت شاہ تذکرہ ناصر بخاری،

سلمان نے گلے سے لگا لیا، اور کئی دن تک مہمان رکھا، ناصر باوجود کمال استادی کے سلمان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے،

عبید زاکانی، ہجوگویوں کا پیشوا، اسی زمانہ میں تھا، ایک دفعہ خواجہ سلمان سفر بہ امیرانہ ساز و سامان کے ساتھ ایک چشمہ کے کنارے خیمہ زن تھے، اتفاق سے عبید زاکانی کہیں سے آنکلا، سلمان نے پوچھا کدھر سے آنا ہوا، عبید نے کہا قزوین سے، سلمان نے کہا سلمان کا کلام کچھ یاد ہو تو سناؤ، عبید نے یہ شعر پڑھے،

من خراباتیم و بادہ پرست　　در خراباتِ مغاں عاشق و مست

می کشندم چو سبو دوش بدوش　　می برندم چو قدح دست بدست

ساتھ ہی کہا، لیکن سلمان بڑے رتبہ کا شخص ہے، یہ شعر اس کے نہیں ہو سکتے، عجب نہیں انکی بیوی کا کلام ہو، سلمان بہت برہم ہوئے، لیکن قیاس سے سمجھا کہ عبید ہے، قسم دیکر پوچھا عبید نے اقرار کیا، اور کہا کہ تم بے دیکھے لوگوں کی ہجویں کرتے ہو، یہ زیبا نہیں، میں بغداد خاص اس غرض سے آیا تھا کہ تم کو ہجوگوئی کا مزہ چکھاؤں، تمھاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے قصداً چھوڑ دیا، سلمان نے شکر گذاری کی، خود گھوڑے پر سوار کرایا، نقدی اور کپڑے دئے، اس پر بھی ہمیشہ عبید کی ہجوگوئی سے ڈرتے رہے[1]،

کلام پر رائے | سلمان کے کمال شاعری کا تمام اساتذہ نے اعتراف کیا ہے، خواجہ حافظ معاصر تھے، تاہم کہتے ہیں،

سرآمد فضلاے زمانہ دانی کیست　　زراہ صدق و یقیں نے زراہ کذب گماں

شہنشاہ فضلا بادشاہ ملکِ سخن　　جمالِ ملت و دیں خواجۂ جہاں سلمان

[1] دولت شاہ حالات عبید زاکانی،

سلمان نے شاعری کی عمارت کمال اسمٰعیل اور ظہیر فاریابی کی دارغ بیل پر قائم کی، اکثر قصائد انہی دونوں کے جواب میں، اور اسی طرز میں لکھے ہیں، مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ سلمان کے اکثر مضامین، اساتذۂ قدیم خصوصًا کمال اسمٰعیل سے ماخوذ ہیں، لیکن سلمان نے ان کو اس قدر ترقی دی کہ جائے اعتراض نہیں، اور اس کی یہ مثال ہے،

کہ ہر چند در و جامہ دگرگوں پوشند	معنی نیک بود شاہد پاکیزہ بدن
کر نہ در خوبیش از پیشتر افزوں پوشند	کسوت عار بود باز پسیں خلعت او
بدر آرند در و اطلس و اکسوں پوشند	ہزاست اینکہ کہن خرقۂ پشمین ز برش

شاعری میں سلمان کا ایک خاص درجہ ہے، یعنی وہ قدما اور متوسطین میں برزخ ہیں، ان کا کلام، قدما کے دور کا خاتمہ اور متوسطین کا آغاز ہے، اُنھوں نے کمال اسمٰعیل اور ظہیر سے زبان کی صفائی اور شستگی لی ہے، اور اس میں ایجاد مضامین کی رنگ آمیزی کی ہے مضمون بندی جو متوسطین اور متاخرین کا مابہ الامتیاز جوہر ہے، گو کمال نے شروع کی لیکن سلمان نے کمال کو پہنچادیا، سلمان نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے، مثنوی جمشید و خورشید، ان کی مشہور مثنوی ہے، اس کا انداز اشعار ذیل سے معلوم ہوگا،

زصندوق چوبیں برآورده سر	شگوفہ چو نازک تنے سیم بر
بریده زبار خودش روزگار	بنفشہ چو مشکیں سر زلف یار
زباں آورے خوب و آزاده است	بر آنم کہ سوسن پریزاده است
ہمی کرد در عشق گل غلغلے	شنیدم کہ پروانہ با بلبلے
زبیداد معشوق ایں داد چیست	ہمی گفت کیں بانگ و فریاد چیست
کہ ہرگز نے نالم از سوختن	ز من عاشقی باید آموختن

به روز من و حال من کس مباد — که یارم رود پیش چشمم به باد

بباید بداں زندہ بگریستن — کہ بے یار خود بایدش زیستن

سلمان نے اگرچہ، مثنوی، قصیدہ، غزل، سب کچھ لکھا ہے لیکن ان کی شاعری کا اصلی میدان قصیدہ گوئی ہے، ان کے قصائد کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

۱۔ زبان کی صفائی اور روانی کے ساتھ ترکیبوں میں وہ چستی جو ان سے پہلے نہ تھی، اور جو خاص متوسطین شعرا کا انداز ہے، مثلاً

خندہ زد دہنت تنگ شکر پیدا کرد — سخنی گفت لبت لولوی تر پیدا کرد

بود تا یافت میان تو لیکن کمرت — چست بربست میان را و بہ زر پیدا کرد

پردہ از چہرہ برانداز کہ آں زلف سیاہ — در سپیدی عذار تو اثر پیدا کرد

باد نوروز نسیم گل رعنا آورد — گرد مشک ختن از دامن صحرا آورد

شاخ را باغ بہ نقش دم طاوس نگاشت — غنچہ را باد بہ شکل سر ببغا (طوطا) آورد

لالہ از دامن کوہ آتش موسی بنمود — شاخ بیروں ز گریباں ید بیضا آورد

از پے خسرو گل، بلبل شیریں گفتار — نغمۂ بارید و صورت نکیسا آورد

سرو را باد صبا منصب بالا بخشد — لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد

صبحگا ہے کہ صبا مجمرہ گرداں باشد — گل فرو کردہ بداں مجمرہ داماں باشد

جامۂ سرو ز استبرق و سندس بافند — کمر کوہ ز پیروزہ و مرجاں باشد

می کند باد صبا طفل چمن را در خواب — ورنہ مہد شجرش بہر چہ جنباں باشد

آب در رود نواہائے تر و تازہ زند — مرغ بر عود سحر ساختہ الحاں باشد

۲۔ دقیق اور نازک مضمون آفرینی جو متوسطین اور متاخرین کا کارنامۂ فخر ہے

چند مثالیں[1] ذیل میں درج ہیں،

دہن و دندان و لب و خال کی تشبیہ

درج[2] در عقیق لبت نقد جاں نہاد | جنس نفیس بود، بہ جاے نہاں نہاد

قفلے ز لعل بر در آں درج زد لبت | خالت ز عنبر آمد و مہرے برآں نہاد

باریک تر ز مو، کمرت را دقیقۂ | ناگاہ در دل آمد و اسمش میاں نہاد

یعنی کمر بند کے خیال میں ایک مضمون یاد آیا جو بال سے بھی باریک تھا، کمر بند نے اس کا نام کمر رکھدیا، مطلب یہ ہے کہ معشوق کی کمر درحقیقت ایک باریک خیال ہے،

بعد ازیں از گرہ زلفِ مغاں، کن تسبیح | پس ازیں از خم ابروی بتاں کن محراب

جدت تشبیہ

خوش برا ہمچو حباب از می گلگون و منہ | ہیچ بنیاد بریں گنبد گردوں چوں حباب

مدتے گردش ایں دائرہ مارا از ہم | ہمچو پرکار جدا کرد و بہم باز آورد

حسن تعلیل تشبیہ

غنچہ با پیش دہان تو صبا خنداں یافت | آں چناں بر دہنش زد کہ دہن پر خوں شد

پا ازیں دائرہ بیروں نہ نہم یکسر مو | گر سراپاے چو پرکار کنند م بدو نیم

دامن از من مکش اے سرو کہ چوں آبِ رواں | من سری در قدمت مے نہم و می گندم

۳۔ مخلص یعنی گریز میں نئے نئے پیرائے پیدا کئے، ایک قصیدہ ہے، جس کی ردیف دست ہے اور قافیے ہزار، نگار، بہار، اس میں گریز کا شعر ہے،

سودائی است ورنہ چرا می کند، دراز | زلفت بہ عہد معدلت شہریار دست

تیری زلف سودائی ہے، ورنہ بادشاہ کے زمانہ میں دست درازی کیوں کرتی،

---

[1] اوپر جو اشعار گذرے ان کو مضمون بندی کی حیثیت سے بھی دیکھنا چاہئے [2] یعنی تیرے ہونٹوں نے عاشق کی نقد جان کو موتی کے ڈبہ (دہن) میں رکھا، اس لئے کہ وہ نفیس چیز تھی اور نفیس چیز کو ایسی ہی مخفی جگہ رکھتے ہیں، پھر ہونٹوں نے ڈبہ پر یاقوت کا قفل لگا دیا، اور تل نے آکر عنبر کی مہر کر دی،

ایک قصیدہ میں تشبیب کے بعد کہتے ہیں،

بعد ازیں غم مخور اے دل کہ غم امروز ہمہ — روزیِ دشمنِ دارائے مظفر شدہ است

اب اے دل غم نہ کھا، کیونکہ اب تو غم، مظفر شاہ کے دشمن کی خوراک بن گیا ہے،

عیش اور رقص و سرود کا بیان کرتے کرتے کہتے ہیں،

مُطربا راہ[1] طرب خوش بزن امروز کہ نیست — جز تو در عہد شہنشاہ جہاں راہ زنے

نیست پیدا، دہنت بر رخ، و در دولت شاہ — فتنۂ آں بہ بہ ہمہ وجہ کہ پنہاں باشد

دو رمستی است دریں دور نہ زیبد کہ بود — بجز از بخت خداوند جہاں کس بیدار

سایۂ زلف تو بر چشمۂ خورشید فتاد — خم زلف تو مگر چتر شہ داد گر است

ہر مشکل مشکل ردیفیں ایجاد کیں اور ان میں اسی روانی اور صفائی کے ساتھ کہتے جاتے ہیں، گویا معمولی ردیفیں ہیں، اس کے ساتھ ہر جگہ ردیف نہایت خوبی سے نمایاں ہوتی ہے مثلاً

منم امروز بلائے شب ہجراں برسر — کردہ در کار تو چوں شمع دل و جاں برسر

دست آنم نہ کہ در دامنت آویزم دست — تا مگر گستردم لطفِ تو داماں برسر

سرو بر پای تو می میرد و مرغانِ چمن — می کنندش ہمہ شب نالہ و افغاں برسر

ماہ تابانِ تو یابد شبِ مشکیں بر دوش — سرو رعنائے تو دارد گلِ خنداں برسر

آفتاب تو اگر سایہ ز من باز گرفت — باز یابند مرا سایۂ سلطاں برسر

مدح کے بعد فخریہ کہتے ہیں،

شعرم از تربیت لطف تو جای برسید — کہ نہندش، ہمہ اشرافِ خراساں برسر

دعائیہ ملاحظہ ہو،

---

[1] راہ کے معنی راگنی کے بھی ہیں اور راستہ کے بھی، پہلے مصرع میں پہلے معنی لئے ہیں اور دوسرے میں دوسرے معنی،

تا زند خسرو گل، تختِ زمرد در باغ | تاج یاقوت نهد لالۂ نعماں بر سر
تیر باراں کند از روے ہوا قوس قزح | ہر دم آرد، سپر لعل، گلستاں بر سر
شجر روضۂ بخت تو چناں مثمر باد | کہ فلک را فگند سایۂ احساں بر سر

اسی طرح دست، پاے، رو وغیرہ ردیفوں میں قصیدے لکھے ہیں،

قطعات | قصیدہ کی افتاد ایسی بُری پڑگئی تھی کہ اس میں بجز معشوق اور ممدوح کی مداحی کے اور کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا، جو شعراء اور اور خیالات ادا کرنے چاہتے تھے، وہ قطعات کے ذریعے سے ادا کرتے تھے،

سلمان نے نہایت کثرت سے قطعات لکھے ہیں، اور اُن میں ہر قسم کے عجیب و غریب مضامین ادا کئے ہیں، افسوس ہے کہ سلمان کا جو دیوان بمبئی میں چھپا ہی، اس میں یہی قطعات نہیں ہیں، جو دیوان کی جان ہے، ہمارے پاس جو قلمی مجموعہ ہے، اس میں سے بعض نمونے درج کئے جاتے ہیں،

بادشاہ نے سلمان کو ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا عنایت کیا تھا، سلمان نے واپس کر دیا، کہ دوسرے رنگ کا گھوڑا مرحمت ہو، داروغۂ اصطبل نے وہ بھی رکھ لیا، اس پر کہتے ہیں،

شاہا مرا بہ اسپے موعود کردہ بودی | در قول پادشاہاں قیلے دگر نباشد
اسپے سیاہ و پیرم دادند و من براَنم | کاندر جہاں سیاہے زاں پیر تر نباشد
آں اسپ باز دادم، تا دیگرے ستانم | بر صدرے کہ کس را زیں سر خبر نباشد
اسپ سیہ بدادم، رنگ دگر ندادند | آرے پس از سیاہی رنگ دگر نباشد"

ایک اور قطعہ میں گھوڑے کی ہجو کی ہے،

شاہا امید بود کہ خواہم بدولتت | بر مرکبے بلند و جوان و رواں نشست

اسپیم پیر و کاہل و کوتہ ہمی دہند | اسپے نہ آں چناں کہ تواکم بداں نشست

چوں کالک مرکب سیہ ست و لاغرست | جہل مرکب است بر اسپے چناں نشست

از بندہ بہتر است بہ سی سال راستی | گستاخی است بر زبر بہتراں نشست

آنکھوں میں آشوب کی وجہ سے دربار میں جانا بند ہوگیا تھا، اسکی معذرت میں ایک قطعہ لکھا ہے

خسروا خاکِ درگہ تو مرا است | از غبار زر وے نیکو تر

لیک در عین حالتے کہ مرا است | غیبتم از حضور نیکو تر

حال چشم بد است، دور از تو | چشم بد، از تو دور نیکو تر

بدن پر کپڑے نہیں رہے تھے، بادشاہ کو قطعہ لکھا،

ای زما مستغنی و از امثالِ ما | بر شما احوالِ ما پوشیدہ نیست

بر تنم پوشیدنی این ست وبس | بندہ را ہیچ از شما پوشیدہ نیست

بادشاہ نے ملبوس خاص بدن سے اتار کر بھیجا اور یہ شعر لکھا،

ہر چند ترا، جامۂ ما پوشیدن | عیب است ولیکن این عیب بپوش

درد پا کی وجہ سے دربار میں نہ جا سکتے تھے، اس کی عذر خواہی کرتے ہیں،

بہر استقبال شاہ از فرق و سر کردم قدم | خواستم تا رو بہ درگاہ ہمایوں آورم

درد پایم گشت از اں مانع کہ آرم ند سر | من کہ در دپای دارم، درد سر چوں آورم

سلمان کی بدعات | سلمان سب سے پہلے شخص ہیں جس نے صنعتِ ایہام کو نہایت کثرت سے برتا،

اس میں اکثر لطیف اور نئے نئے پیرائے پیدا کیے، مثلاً

قد تو صنوبر در چشم من نیاید | او کیست تا قدرت را قائم مقام باشد

کی تواند دلم از موی میانِ تو گذشت | کہ شب تیرہ و تاریک ہمی برکمرست

چشم سرمستِ ترا عین بلا می بینم | لیکن ابروے تو چیزے ست کہ بالاے بلاست
فتنہ در دور تو بیمار و ضعیف افتادہ است | آن چنان نیست کہ تا حشر تواند برخاست
با چنیں عارضہ و ضعف، تمنای نجات | دارم اما ہمہ موقوف اشارات شماست
سرو را باد صبا منصب بالا بخشید | لالہ را لطفِ ہوا خلعت والا آورد
در ببست با دلم دہنِ تنگ او بہ ہیچ | و این چنیں مضائقہ بسیار می کند
نیست سودائے سر زلفِ تو کار ہمہ کس | کاں طریقے است خم اندر خم و دل گیر و دراز

لیکن اکثر اس قدر بے اعتدالی برتی کہ ضلع جگت کی حد تک نوبت پہونچ گئی سیکڑوں اشعار ہیں جن میں صرف رعایت لفظی سے کام لیا ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ بدعت مقبول عام نہ ہوئی ورنہ ایران میں بھی بہت سے امانت پیدا ہو جاتے،

غزلیں | سلمان کی غزلیں چنداں مقبول نہیں ہوئیں، ان سے پہلے سعدی کا رنگ عالم کو مسخر کر چکا تھا، اس رنگ میں وہ کہہ نہیں سکتے تھے، اس لئے مضمون آفرینی شروع کی، لیکن لوگوں کے کانوں میں سعدی کی نے گونج رہی تھی، اس لئے اُن کی آواز خالی گئی، سعدی ہی کا رنگ جب خواجہ حافظ نے اختیار کیا اور اس شراب کو اور تیز کر دیا تو ع حریفاں را نہ سرماند و نہ دستار

نمونہ کے طور پر ہم سلمان کی ایک دو غزل اور متفرق اشعار نقل کرتے ہیں،

بہ سر کوے تو سوگند کہ تا سر دارم | نیست ممکن کہ من از حکم تو سر بر دارم
ای کہ در خواب غروری خبرت نیست کہ من | ہر شب از خاکِ درت بالش و بستر دارم
ساغرم پر می و می در سر و سر در کفِ دست | تو چہ دانی کہ من امروز چہ در سر دارم
گفتۂ در قدمم گوہر اندازم بہ چشم | اینک از بہر قدمہاے تو گوہر دارم

دل برود دلبرو در دام بلاش اندازد — دل ما برد، کنون تا به کجاش اندازد

چشم فتّانِ تو هر جا که بلا انگیزد — ای بسا کس که دران عرصه بلاش اندازد

هر کجا مرغ دلی بال کشاید، الحال — به کمان خانهٔ ابرو، ز هواش اندازد

خوش کمندی است سر زلف پر شکن شکنش — ده چه خوش باشد اگر بخت به ماش اندازد

عاقل آن است که در پای تو اندازد سر — پیشتر زان که فراقِ تو ز پاش اندازد

بوی گیسوی تو هر جا که جگرسوخته‌ایست — در پے قافلهٔ باد صباش اندازد

هر کرا درد بیند اخت دوا چاره کند — که کند چارهٔ سلمان چو دواش اندازد

یک شب خیال چشم تو دیدیم ما بخواب — زان شب دگر به چشم ندیدیم خواب را

غمزه ات دل می برد، چشم توام خون می خورد — روز و شب و در شکار این در شراب افتاده است

زاهد هر دم تو به ز روی تو زہے روی — هیچش ز خدا شرم، و ز روی تو حیا نیست

من خراباتیم و باده پرست — در خراباتِ مغان عاشق و مست

می کشندم چو سبو دوش بدوش — می برندم چو قدح دست بدست

ظاهر نمی شود اثر صبح گوئیا — دود دلم دریچهٔ خاور گرفته است

خواجہ حافظ شیرازی

تاریخ شاعری کا کوئی واقعہ اس سے زیادہ افسوسناک نہیں ہوسکتا کہ خواجہ حافظ کے حالاتِ زندگی اس قدر کم معلوم ہیں کہ تشنگان ذوق کے لب بھی تر نہیں ہوسکتے۔ اس پایہ کا شاعر یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کثرت اور تفصیل سے اس کی سوانحعمریاں لکھی جاتیں کہ اسکی تصویر کا ایک ایک خد و خال آنکھوں کے سامنے آجاتا، لیکن ہمارے تمام تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ان سب کو جمع کردیا جائے، تب بھی ان کی زندگی کا کوئی پہلو نمایاں ہوکر نہیں نظر آتا، جس قدر تذکرے ہیں، سب ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں، اور وہی چند واقعات ہیں جن کو باختلاف الفاظ سب نقل کرتے آتے ہیں، ان سب میں عبدالنبی فخرالزمانی نے اپنے تذکرہ میخانہ میں جو جہانگیر کے عہد میں ۱۰۳۶ھ میں لکھا گیا، ابتدائی حالات اوروں کی نسبت اچھے بہم پہنچائے ہیں، حبیب السیر میں جستہ جستہ کچھ واقعات ملتے ہیں، خود حافظ کے کلام میں جابجا واقعات کے اشارے ہیں، ان سب کو ترتیب دے کر اُن کی زندگی کی تصویر کھینچتا ہوں، لیکن دراصل یہ تصویر نہیں بلکہ خاکہ ہے اور زیادہ سچ یہ ہے کہ خاکہ بھی نہیں بلکہ محض چند لکیریں ہیں،

نام و نسب خواجہ صاحب کے دادا، اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے، اتابکان شیراز کے زمانہ میں شیراز میں آئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی، خواجہ صاحب کے والد کا نام بہاء الدین تھا، اُنھوں نے یہاں تجارت شروع کی اور کاروبار کو اس قدر

ترقی دی کہ دولت مندوں میں ان کا شمار ہونے لگا، بہاء الدین نے جب انتقال کیا تو تین بیٹے چھوڑے، ان کو اگرچہ باپ سے بہت بڑا ترکہ ملا تھا، لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ نہ تھا، چند روز میں باپ کی کمائی سب اڑ گئی، بیٹے پریشان ہوکر کہیں سے کہیں نکل گئے، لیکن خواجہ صاحب کمسنی کی وجہ سے اپنی ماں کے ساتھ شیراز ہی میں رہ گئے، گھر میں فاقے ہونے لگے تو ان کی ماں نے ان کو محلہ کے ایک آدمی کے حوالہ کردیا، کہ اپنی خدمت میں رکھے اور کھانے پینے کی کفالت کرے، لیکن یہ شخص بد اطوار تھا، خواجہ سن شعور کو پہونچے تو اس کی صحبت ناگوار ہوئی، چنانچہ اس سے قطع تعلق کرکے خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا، آدھی رات سے اٹھ کر صبح تک خمیر گوندھتے، گھر کے پاس ہی ایک مکتب خانہ تھا، محلے کے سب لڑکے اس میں پڑھتے تھے، خواجہ صاحب اکثر ادھر سے نکلتے تو دل میں تعلیم کی تحریک پیدا ہوتی، رفتہ رفتہ شوق اس قدر بڑھا کہ مکتب میں داخل ہوگئے، خمیر سے جو کچھ حاصل ہوتا اس میں سے ایک تہائی ماں کو اور ایک معلم کو دیتے، بقیہ خیرات کرتے، مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا، معمولی سواد خوانی کی بھی لیاقت حاصل کی، اس زمانہ میں شعر و شاعری کا گھر گھر چرچا تھا، محلے میں ایک بزاز رہتا تھا، وہ سخن سنج اور موزوں طبع تھا، اس مناسبت سے اور ارباب ذوق بھی اس کی دوکان پر آبیٹھتے تھے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے، خواجہ صاحب پر بھی اس مجمع کا اثر ہوا، چنانچہ شاعری شروع کی، لیکن طبیعت موزوں نہ تھی، بے تکے شعر کہتے اور لوگوں کو تفریح طبع کا سامان ہاتھ آتا، رفتہ رفتہ ان کی لغو گوئی کی شہرت تمام شہر میں پھیل گئی، لوگ تفریح کے لئے ان کو صحبتوں میں بلاتے اور لطف اٹھاتے، دو سال تک یہی حالت رہی، لوگوں کا استہزا حد سے بڑھا تو ان کو بھی احساس ہوا، ایک دن نہایت رنجیدہ ہوئے اور

بابا کوہی کے مزار پر جاکر پھوٹ پھوٹ کر رو ئے، رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے، نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جناب امیر علیہ السلام ہیں، صبح کو اٹھے تو یہ غزل لکھی،

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　　　وندراں ظلمتِ شب آب حیاتم دادند

شہر میں آئے تو لوگوں نے حسب معمول شعر پڑھنے کی فرمائش کی، انھوں نے وہی غزل پڑھی، سب کو حیرت ہوئی، اور سمجھے کہ کسی سے یہ غزل لکھوالی ہے، امتحان کے لئے طرح دی، انھوں نے طرح میں بھی عمدہ غزل لکھی، اسی وقت گھر گھر چرچا پھیل گیا،

یہ تمام واقعات عبدالنبی نے میخانہ میں لکھے ہیں، اس میں اگرچہ خوش اعتقادی اور وہم پرستی نے بعض باتیں بڑھادی ہیں، یا اصل واقعات کی صورت بدل دی ہے تاہم بہت کچھ اصلی واقعات بھی ہیں،

خواجہ صاحب کے کمالات اور شاعری کا چرچا عام ہوا، تو دور دور سے سلاطین اور امرا نے ان کے بلانے کے لئے خطوط بھیجے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں شیراز میں متعدد حکومتیں قائم ہوئیں، اور حسنِ اتفاق یہ کہ فرماں روا عموماً خود صاحبِ علم و فضل اور علما اور شعرا کے نہایت قدردان تھے،

غازان خاں (چنگیز خاں کا پوتا) کے زمانہ میں غازان خاں کی طرف سے محمد شاہ انجو، فارس اور شیراز کا حکمراں مقرر ہو کر آیا تھا، اس کے خاندان میں سے شاہ ابو اسحاق خواجہ حافظ کے زمانہ میں تھا، وہ نہایت قابل اور فاضل تھا، خود شاعر اور شعراء کا مربی اور قدردان تھا، اس کے ساتھ نہایت عیش پرور اور لہو و لعب کا دلدادہ تھا، اس بنا پر اگرچہ ملکی انتظامات بے اصول تھے، لیکن گھر گھر عیش و نشاط کے چرچے

تھے، اور شیراز باغ ارم بن گیا تھا، خواجہ حافظ کی مستانہ غزلوں میں اس دور کا اثر شامل ہے
شاہ ابواسحق کی عیش پسندی حد سے بڑھ گئی تو ۷۴۷ھ میں محمد مظفر نے اس پر لشکرکشی
کی، فوجیں شہرپناہ کے دامن میں آگئیں، لیکن ابواسحق کو کوئی شخص خبر نہیں کر سکتا تھا، امین الدین
نے کہ مقرب خاص تھا، ابواسحق سے کہا کہ جوش بہار نے شہر کو چمنستان بنا دیا ہے، حضور
ذرا بالاخانہ پر چل کر سیر فرمائیں، ابواسحق نے بالاخانہ پر چڑھ کر دیکھا تو چاروں طرف
فوجیں پھیلی ہوئی ہیں، پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ شاہ مظفر کا لشکر ہے،
مسکرا کر کہا عجب احمق ہے، اس بہار میں یوں اوقات خراب کرتا ہے، یہ شعر پڑھ کر
نیچے اتر آیا،

بیا تا یک امشب تماشا کنیم | چو فردا شود فکر فردا کنیم

غرض مظفر نے شیراز فتح کر لیا، اور شاہ ابواسحق قتل کر دیا گیا، خواجہ صاحب
کو سخت رنج ہوا، چنانچہ ایک قطعہ لکھا جس میں اس عہد کے تمام ارباب کمال کا تذکرہ کیا،

بہ عہد سلطنت شاہ شیخ ابواسحق | بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد
نخست بادشہی ہمچو او ولایت بخش | کہ گوئی فضل بود او بہ عدل و بخشش و داد
دوم بقیہ ابدال شیخ امین الدین | کہ بود داخل اقطاب و مجمع اوتاد
سوم چو قاضی عادل اصیل ملت و دین | کہ قاضئی بہ ازو آسمان ندارد یاد
دگر چو قاضی فاضل عضد کہ در تصنیف | بنای شرح مواقف بنام شاہ نہاد
دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل | کہ او بہ جود چو حاتم، ہمی صلا در داد
نظیر خویش بہ نگذاشتند و بگذشتند | خدای عزوجل جملہ را بیامرزاد

شاہ ابواسحق کے مرنے کا صدمہ، خواجہ صاحب کو مدت تک رہا، غزلوں میں بھی

بے اختیار ابو اسحاق کا نام زبان پر آجاتا ہے،

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی　　　خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

ابو اسحاق کے بعد محمد بن مظفر مبارز الدین، شیراز و فارس کا حکمران ہوا، وہ اصل مین خراسان کا باشندہ تھا، جس زمانہ مین سلطان ابو سعید نے وفات پائی اور طوائف الملوکی شروع ہوئی تو اس نے ۷۴۱ھ مین فوجین فراہم کر کے آس پاس کے مواضع پر حملہ شروع کیا، سب سے پہلے یزد پر قبضہ کیا، رفتہ رفتہ اس کے حدود حکومت نہایت وسیع ہو گئے،

محمد بن مظفر نہایت متقشف تھا تخت نشین ہونے کے ساتھ ہر جگہ محتسب مقرر کئے اور تمام میخانے بند کرا دیئے، تذکرۂ تقی الدین حسینی مین لکھا ہے کہ خواجہ حافظ نے اسی واقعہ پر یہ غزل لکھی ہے،

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است　　　بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است

در آستین مرقع پیالہ پنہان کن　　　کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریز است

ز رنگ بادہ بشوئید خرقہا از اشک　　　کہ موسمِ ورع و روزگار پرہیز است

خواجہ صاحب کے دیوان مین ایک غزل ہے جو شراب خانون کے بند ہونیکا نہایت پر اثر مرثیہ ہے،

بود آیا کہ در میکدہا بکشایند؟　　　گرہ از کار فروبستۂ ما بکشایند

گیسوے چنگ ببرید بمرگ مئے ناب　　　تا ہمہ مغبچہ ہا زلفِ دوتا بکشایند

نامۂ تعزیت دختر رز بنویسید　　　تا حریفان ہمہ خون از مژہ ہا بکشایند

در میخانہ بہ بستند خدایا میسند　　　کہ در خانہ تزویر و ریا بکشایند

اگر از بہر دلِ زاہد خود بین بستند　　　دل قوی دار کہ از بہر خدا بکشایند

یہ غزل اسی زمانہ کی ہے،

امیر مبارز الدین کا بیٹا شاہ شجاع جس کا ذکر آگے آتا ہے، اس نے بھی اس موقع پر ایک رباعی لکھی اور خوب لکھی،

در مجلس دہر ساز مستی پست است — نہ چنگ نہ قانون و نہ دف بر دست است

رندان ہمہ ترک مے پرستی کردند — جز محتسب شہر کہ بے مے مست است

امیر مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع فرمان روا ہوا، وہ اس سلسلہ کا سرتاج اور علم و فن کا پشت و پناہ تھا، وہ علم و فن کی گود میں پلا تھا، سات برس کے سن مین تعلیم شروع کی، نو برس مین قرآن مجید حفظ کیا، قاضی عضد سے شرح مفصل وغیرہ پڑھی،

حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ کے سننے مین عربی کے چھ سات شعر یاد ہو جاتے تھے، عربی و فارسی مین اس کے مکاتبات اہل ادب مین مقبول عام ہین، علم و فضل کی قدردانی کی وجہ سے اس کا دربار علما و فضلا کا قبلۂ حاجات تھا، شعر بھی کہتا تھا، تقی الدین حسینی نے اپنے تذکرہ مین بہت سے اشعار لکھے ہین، ایک رباعی یہ ہے،

احوال بدم ز خلق پنہان مے کن — واہوال جہان بر دلم آسان می کن

امروز خوشم بدار و فردا با من — انچہ از کرم تو می سزد آن می کن

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع سے پہلے میخانون کی جو روک ٹوک تھی شاہ شجاع نے آزادی تجارت کے لحاظ سے اٹھا دی، خواجہ صاحب کے دیوان مین ایک غزل ہے وہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

غزل یہ ہے،

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش — کہ دور شاہ شجاع است می دلیر بنوش

شد آں، کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند ‏ ‏ ‏ ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
بہ بانگ چنگ بگوئیم آں حکایتہا ‏ ‏ ‏ کہ از شنیدن آں دیگ سینہ میزد جوش
رموز مملکتِ خویش خسرواں دانند ‏ ‏ ‏ گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کی آزاد پسندی نے میخواروں کو بہت آزاد کر دیا تھا، اس بنا پر خواجہ صاحب اس کے بہت ممنون ہیں، اور جو غزلیں شاہ شجاع کی مدح میں لکھی ہیں، سب میں اس کا بڑے جوش سے تذکرہ کیا ہی،

قسم بہ حشمت و جاہ و جلال شاہ شجاع ‏ ‏ ‏ کہ نیست باکسم از بہر مال و جاہ نزاع
ببیں کہ رقص کناں می رود بہ نالۂ چنگ ‏ ‏ ‏ کسے کہ اذن نمی داد استماع سماع

ایک اور غزل میں کہتے ہیں۔

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر ‏ ‏ ‏ جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد مناع
عمر خسرو طلب ار نفع جہاں می طلبی ‏ ‏ ‏ کہ وجودیست عطا بخش و کریمی نفاع
مظہر لطفِ ازل روشنیٔ چشم امل ‏ ‏ ‏ جامع علم و عمل جانِ جہاں شاہ شجاع

خواجہ صاحب نے اگرچہ جابجا اپنے اشعار میں شاہ شجاع کا نام مداحانہ انداز سے لیاہے، چنانچہ ایک غزل میں فرماتے ہیں،

خیال آبِ خضر بست و جام کیخسرو ‏ ‏ ‏ بہ جرعہ نوشے سلطان ابوالفوارس شد
(شاہ شجاع کی کنیت)

لیکن شاہ شجاع خواجہ صاحب سے صاف نہ تھا، شجاع کے عہد میں خواجہ عماد فقیہ مشہور عالم تھے، شجاع ان کا نہایت معتقد تھا،

خواجہ عماد کی ایک بلی تھی جس کو انھوں نے اس طرح تعلیم دی تھی کہ جب وہ نماز پڑھتے تو بلی بھی نماز پڑھنے کے انداز سے جھکتی اور سر اٹھاتی، خواجہ حافظ نے

اسی زمانہ میں ایک غزل لکھی،

صوفی بہ جلوہ آمد و آغاز ناز کرد
بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اس غزل میں ظرافت سے یا خواجہ عماد کو ریاکار سمجھ کر خواجہ صاحب نے یہ شعر لکھا[1]

اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز
غرہ مشو کہ گربہ عابد نماز کرد

غالباً شجاع کی ناراضی کی ابتدا اسی شعر سے ہوئی، رفتہ رفتہ کبیدگی زیادہ بڑھتی گئی، ایک دن شجاع نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ کی کوئی غزل یکساں اور ہموار نہیں ہوتی، ایک شعر میں تصوف، دوسرے میں مے پرستی، تیسرے میں شاہد بازی، اس طرح ہر شعر میں رنگ بدلتا جاتا ہے،

خواجہ صاحب نے کہا ہاں، لیکن ان سب برائیوں کے ساتھ بھی میری غزلیں میری زبان سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل جاتی ہیں، بخلاف اوروں کے کہ ان کا قدم شہر کے دروازے سے بھی باہر نہیں نکلتا، شجاع کو اس گستاخانہ اور آزادانہ جواب پر اور زیادہ ملال ہوا،

اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں خواجہ صاحب نے ایک اور غزل لکھی جس کا مقطع تھا،

گر مسلمانی این است کہ حافظ دارد
وای اگر در پس امروز بود فردائے

شجاع نے یہ غزل سنی تو اس بہانہ سے کہ اس سے قیامت کا انکار یا کم از کم شبہہ پایا جاتا ہے، خواجہ صاحب کو ستانا چاہا، خواجہ صاحب بہت پریشان ہوئے حسن اتفاق یہ کہ مولانا زین الدین ابوبکر تائبادی حج کو جاتے ہوئے، شیراز سے گذرے، خواجہ صاحب نے ان سے یہ ماجرا بیان کیا، انھوں نے صلاح دی کہ مقطع کے اوپر ایک شعر

---

[1] حبیب السیر

لکھدو جس سے مقطع دوسرے کا مقولہ بن جائے، خواجہ صاحب نے اسی وقت کہا،

دی دو ہتیم چہ خوش آمد کہ سحرگہ می گفت　　　بادف و بربط و نے، منبچہ ترسائے

شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ مین انتقال کیا، اس کے بعد شاہ منصور بن محمد مظفر بادشاہ ہوا، وہ بھی بڑی شوکت و شان کا بادشاہ تھا، خواجہ صاحب نے اس کی مبارکباد مین غزل لکھی،

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید　　　نوید فتح و ظفر تا بہ مہر و ماہ رسید

منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا کہ تیمور نے شیراز پر حملہ کیا،

منصور اگرچہ نہایت دلیر اور صاحب عزم تھا، لیکن تیمور کی سطوت و عظمت کا غلغلہ تمام عالم مین پڑ چکا تھا، اس لئے چاہا کہ شیراز سے نکل جائے، شہر پناہ کے دروازہ پر پہنچا تو ایک بڑھیا نے کہا کہ ایک مدت تک بادشاہی کر کے رعایا کو مصیبت مین چھوڑ کر کہان بھاگے جاتے ہو؟ منصور وہین سے پلٹا اور صرف دو ہزار فوج سے تیمور پر حملہ آور ہوا اور پے در پے تیمور کی فوجون کو شکست دیتا ہوا قلب فوج تک پہنچ گیا، تیمور پر تلوار کا وار کیا، قماری ایتاق نام ایک افسر نے بڑھ کر تلوار کو سپر پر روکا، چار دفعہ پے در پے تلوار ماری لیکن ہر دفعہ قماری ایتاق سپر ہو جاتا تھا اور تیمور کو بچا لیتا تھا، بالآخر فوجون نے چارون طرف سے ہجوم کر کے منصور کو قتل کر دیا، جس کا خود تیمور کو افسوس رہا، وہ کہا کرتا تھا کہ آج تک معرکون مین کسی کو منصور کا ہمسر نہین دیکھا،

تیمور نے خواجہ حافظ کو طلب کیا اور کہا کہ مین نے تمام عالم کو اس لئے ویران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو کہ میرا وطن ہے آباد کرون، تم ان کو ایک تل کے عوض مین دئے ڈالتے ہو،

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را　　　بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے کہا انہی فضول خرچیون کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت

۱؎ حبیب السیر

پہنچی ہے،

خواجہ صاحب کی غزلین اب، چار دانگ عالم مین پھیل گئین، چنانچہ خود کہتے ہین،

بہ شعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند　　سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

اس زمانہ مین جس قدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ صاحب کے کلام سے لطف اٹھائین، چنانچہ عراق، عرب، ہندوستان، ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے، بغداد کا فرمان روا سلطان احمد بن اویس تھا جو تمام کمالات کا مجموعہ تھا، مصوری، زرنگاری، کمان سازی، خاتم بندی وغیرہ ان تمام فنون مین بڑے بڑے صنّاع اس کی شاگردی کا دم بھرتے تھے، موسیقی مین یہ کمال تھا کہ خواجہ عبدالقادر نے اس کی شاگردی اختیار کی، اس فن مین اس کی متعدد تصنیفات ہین، جو مدت تک گویّون کا دستور العمل رہین، ان باتون کے ساتھ سخن سنج اور شاعر تھا،[۱] خواجہ صاحب کو اس نے بار بار بلایا، خواجہ صاحب بھی للچائے، چنانچہ بعض غزلون مین اس کے اشارے بھی ہین، لیکن پھر بھی رکناباد کی خاک دامن نہین چھوڑی بھی،

چنانچہ خود فرماتے ہین،

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر　　نسیمِ بادِ مُصلّٰی و آبِ رکنا باد

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر سلطان احمد کو بھیجی،[۲]

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان　　احمد شیخ اویس حسن الجانی

خان بن خان شہنشاہ شہنشاہ نژاد　　آن کہ می زیبد اگر جان جہانش خوانی

از گل فارسیم، غنچۂ عیشے نہ شگفت　　حبذا دجلۂ بغداد و مے روحانی

بر شکن کاکل ترکانہ کہ در طالع تُست　　دولتِ خسروی و منصب چنگیز خانی

---

[۱] دولت شاہ　[۲] ایضاً

اگرچہ خواجہ صاحب بغداد جا نہ سکے، لیکن شوق کا کانٹا ہمیشہ دل میں کھٹکتا رہا، چنانچہ جا بجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

خرم آں روز کہ حافظ رہ بغداد کند　　رہ نہ بردیم بہ مقصود خود اندر شیراز

دکن میں سلاطین بہمنیہ کا دور تھا، اور سلطان شاہ محمود بہمنی مسند آرا تھا، وہ نہایت قابل اور صاحب کمال تھا، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت فصاحت اور روانی کے ساتھ شعر کہہ سکتا تھا، عام حکم تھا کہ عرب وعجم سے جو شاعر آئے اس کو پہلے قصیدہ پر ایک ہزار ٹنکہ جو ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے تھے، انعام میں دیئے جائیں، اس کی قدر دانیوں کا شہرہ سن کر خواجہ صاحب کو دکن کے سفر کا خیال ہوا، لیکن خیال ہی خیال تھا، یہ خبر میر فضل اللہ کو پہنچی جو محمود کے دربار میں صدارت کے منصب پر ممتاز تھے، انھوں نے زاد راہ بھیجکر طلبی کا خط لکھا، خواجہ صاحب نے اس روپیے میں سے کچھ بھانجوں کی ضروریات میں صرف کئے، کچھ ادائے قرض میں صرف ہوا، جو باقی رہ گیا اس سے زاد راہ سفر کا سامان کرکے شیراز سے روانہ ہوئے، مقام لار میں پہونچے تو وہاں ایک دوست سے ملاقات ہوئی جن کا مال اور اسباب حال ہی میں لٹ گیا تھا، خواجہ صاحب نے جو کچھ پاس تھا ان کے حوالہ کردیا، اور آپ خالی ہاتھ رہ گئے، اتفاق یہ کہ خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کازرونی جو مشہور تاجر تھے، ہندوستان آرہے تھے ان کو یہ حال معلوم ہوا تو خواجہ صاحب کے مصارف کے کفیل ہوئے، لیکن سوداگروں سے ایک نازک مزاج شاعر کی ناز برداریاں کہاں انجام پاسکتی ہیں، خواجہ صاحب کو رنج ہوا تاہم صبر کیا، اور محمود شاہی جہاز پر جو دکن سے ہرمز کے بندرگاہ میں آیا تھا، اور ہندوستان کو واپس

جا رہا تھا، سوار ہوئے، سو، اتفاق یہ کہ جہاز نے لنگر بھی نہیں اٹھایا تھا کہ ہوا کا طوفان اٹھا، خواجہ صاحب فوراً جہاز سے اتر آئے اور یہ غزل لکھ کر فضل اللہ کو بھیجی،

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بہ می بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

شکوہ تاجِ سلطانی کہ بیم جان درو درج است — کلاہ دلکش است امّا بہ درد سر نمی ارزد

بہ کوے میفروشانش بہ جامے در نمی گیرند — زہی سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد

بس آساں می نمود اول غم دریا بہ بوے دُر — غلط کردم کہ یک موجش بہ صد من زر نمی ارزد

فضل اللہ نے غزل سلطان محمود بہمنی کی خدمت میں پیش کی اور تمام ماجرا بیان کیا، سلطان نے ملا محمد قاسم مشہدی جو دربار کے فضلاء میں سے تھے، ایک ہزار ٹنکہ طلا دیا کہ ہندوستان کے عمدہ مصنوعات خرید کرکے لیجائیں اور خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کریں[1]،

سلطان غیاث الدین بن سلطان سکندر فرماں روائے بنگالہ نے بھی جو ۷۶۸ھ میں تخت نشین ہوا تھا، خواجہ صاحب کے کلام سے مستفید ہونا چاہا، چنانچہ طرح کا یہ مصرع بھیجا،

ع ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر بھیجی،

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود — ویں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین — غافل مشو کہ کار تو از نالہ می رود

خواجہ صاحب نے ۷۹۳ھ میں وفات پائی، "خاکِ مصلّےٰ" تاریخ ہے، جس میں ایک عدد کی کمی ہے،

---

[1] یہ پورا قصہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

مصلے ان کا محبوب مقام تھا اس لئے دفن بھی یہیں ہوئے، سلطان بابر بہادر کے زمانہ میں محمد معمائی نے جو صدارت کی خدمت پر ممتاز تھا، خواجہ صاحب کا مقبرہ بصرف کثیر تیار کرایا جواب تک قائم ہے، ان کے نام کی مناسبت سے اس جگہ کا نام حافظیہ ہو گیا ہے، ہفتہ میں ایک خاص دن مقرر ہے لوگ زیارت کو جاتے ہیں، وہیں دن بسر کرتے ہیں، کھاتے پکاتے ہیں، چاء پیتے ہیں، کہیں کہیں شراب کا دور بھی چلتا ہے، کوئی رنگین مزاج خواجہ صاحب کے نام کا حصہ خاک پر گرا دیتا ہے، خواجہ صاحب نے پانسو برس پہلے کہدیا تھا،

بر سر تربتِ ما چوں گذری ہمت خواہ	کہ زیارت گہ رندانِ جہاں خواہد بود

آل و اولاد — خواجہ صاحب کی آزادہ مزاجی اور رندی سے قیاس ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کے بکھیڑوں سے آزاد ہوں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شادی بھی کی تھی اور اولاد بھی تھی صاحبزادہ کا نام شاہ نعمان تھا، وہ ہندوستان میں آئے اور یہیں بہ مقام برہان پور وفات کی، ان کی قبر قلعہ اسیر کے متصل ہے[1]،

دیوان میں ایک قطعہ ہے،

صباح جمعہ بد و سادس ربیع اول	کہ گشت فرقت آں مہ بکشتیم حاصل
بہ سال ہفتصد و شصت و چہار از ہجرت	چو آب حل بشدم ایں دقیقۂ مشکل

غالبًا یہ قطعہ بیوی کی وفات میں لکھا ہے، ایک اور قطعہ ہے،

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند	چہ دید اندر خم ایں طاق رنگیں
بجائے لوحِ سیمیں در کنارش	فلک بر سر نہادہ لوحِ سنگیں

---

[1] خزانۂ عامرہ بہ حوالہ مرآۃ الصفا،

اگرچہ ممکن ہے کہ یہ قطعہ کسی اور جوانہ مرگ کی شان میں ہو لیکن زیادہ قیاس یہی ہے کہ خود انہی کا کوئی فرزند تھا جو آغاز عمر میں گذر گیا تھا،

خواجہ صاحب کی تحصیل علم اور ان کے مبلغ کا حال تذکرہ نویسوں نے مطلق نہیں لکھا، میخانہ سے جس کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے، صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ محلہ میں جو مکتب تھا، اس میں تعلیم پائی تھی، لیکن کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے علوم درسیہ کی تحصیل مستعدانہ کی تھی، اکثر غزلوں میں عربی کے مصرعے جس برجستگی سے لاتے ہیں، اس سے ان کی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

بعض غزلوں میں متعدد شعر، خالص عربی میں ہیں اور سلاست و فصاحت میں جواب نہیں رکھتے،

الا اے ساربان محمل دوست	الی رکبانکم طال اشتیاقی
درونم خوں شد از نادیدن یار	الا نفیالاہ یا مد الفراق
بیا ساقی بدہ رطل گرانم	سقاک اللہ من کاس دھاق
نہانی الشیب من وصل الغوانی	سوی تقبیل خد و اعتناق

سلام اللہ من کر اللیالی	علی ملک المکارم والمعالی
فحبک راحتی فی کل حین	و ذکرک مونسی فی کل حال
سبت سلمیٰ بصدغیہا فوادی	وروحی کل یوم لی تنادی

گر تیغ بارد در کوے آں ماہ	گردن نہادیم الحکم للہ
الصبر مر والعمر فان	یا لیت شعری حتام القاہ

جا بجا عربی کے جملے اس خوبصورتی سے پیوند کرتے ہیں کہ گویا انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے،

چو ہست آب حیاتت بدست تشنہ میر | فلا تمت و من الماء کل شئ حی
بخیل، بوے خدا نشنود، بیا حافظ | پیالہ گیر و سخن ورز و الضمان علی

قرآن مجید اور تفسیر کے ساتھ اُن کو خاص لگاؤ تھا، دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ تفسیر کشاف پر حاشیہ بھی لکھا ہے، خود فرماتے ہیں،

زحافظانِ جہاں کس چو بندہ جمع نکرد | لطائف حکما با کتاب قرآنی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب قرآن مجید کی تفسیر میں معقول کو منقول سے تطبیق دیتے تھے، فن قرارت میں کمال تھا، اس کے ساتھ خوش آواز تھے، معمول تھا کہ ہمیشہ جمعہ کی رات کو مسجد کے مقصورہ میں تمام رات خوش الحانی کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے[۱]، قرآن مجید حفظ یاد تھا، اور اس مناسبت سے حافظ تخلص رکھا تھا، قرآن دانی پر انکو ناز تھا، چنانچہ اشعار میں جا بجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

ندیدیم خوشتر از شعر تو حافظ | بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری
صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ | انچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم

تجرد اور آزادی | عام تذکروں کا بیان ہے کہ خواجہ صاحب دنیاوی تعلقات سے آزاد تھے، اور سلاطین و امراء سے بے نیاز رہتے تھے، لیکن خود ان کے کلام سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی، ان کے زمانہ میں شیراز کے جو جو فرماں روا گذرے، سب کی مدح میں ان کے قصائد موجود ہیں، اور اسی شان کے ہیں جو عام مدح گویوں کا انداز ہے، شاہ شجاع کی مدح میں نونیہ قصیدہ ہے، جس میں لکھتے ہیں،

دارای دہر، شاہ شجاع، آفتاب ملک | خاقانِ کامگار و شہنشاہِ نوجواں

---

[۱] ہفت اقلیم امین رازی،

حکمش رواں چو باد براطرافِ بحر و بر | ہرس رواں چو روح دراعضائے انس و جاں
بے طلعتِ تو جاں نہ گراید بہ کالبد | بے نعمتِ تو مغز نہ بندد دراستخواں

سلطان ابو اسحٰق کی مدح میں بڑے زور کا قصیدہ لکھا ہے، جس کا مطلع یہ ہی،

سپیدہ دم کہ صبا بوی بوستاں گیرد | چمن ز لطفِ ہوا نکتہ بر جناں گیرد

مدح میں لکھتے ہیں،

جمالِ چہرۂ اسلام شیخ بو اسحاق | کہ ملک در قدمش زیب بوستاں گیرد

سلطان محمود کی مدح مثنوی میں لکھی ہے جس کا ذکر آگے آئیگا، منصور کے وزراء میں سے ایک بدہمت نے راے دی تھی کہ علماء و فضلا کے وظیفے جن کی تعداد ۷ تومان تھی بند کر دیئے جائیں، منصور نے نہ مانا، اس پر خواجہ صاحب نے قصیدہ لکھا[1]

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم | یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم
منصور بن محمد غازی است حرز من | وزایں خجستہ نام براعدا مظفرم
ای شاہ شیرگیر چہ کم گردد، اگر شود | در سایۂ تو ملکِ فراغت میسرم

جابجا خود ان کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین اور امراء کے نام مدحیں لکھ کر بھیجیں کہ صلہ ہاتھ آئے، چنانچہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں،

شاہ ہرموزم نہ دیدو بے سخن صد لطف کرد | شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نہ داد
کارِ شاہاں ایں چنیں باشد تو ای حافظ مرنج | داور روزی رساں توفیق و نصرت شاں دہاد

ایک اور قطعہ میں لکھتے ہیں،

خسروا! دادگرا! شیر دلا! بحر کفا | اے کمالِ تو بہ انواعِ ہنر ارزانی

---

[1] حبیب السیر،

دردو سال آنچہ بیند و ختم از شاہ و وزیر | ہمہ بر بود بہ یک دم فلک چوگانی

غرض یہ بالکل غلط ہے کہ خواجہ صاحب ہات پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تھے، اور کسب معاش کی کچھ فکر نہ کرتے تھے، البتہ فرق یہ ہے کہ اُن کے تمام معاصرین بلکہ پیشرو نہایت ذلیل اور کمینہ طریقوں سے کام لیتے تھے، انوری ظہیر فاریابی، سلمان ساوجی کس پایہ کے لوگ تھے، لیکن سب کا یہ حال تھا کہ کسی کی مدح لکھی اور اس نے صلہ کم دیا یا دیر لگائی تو ہجو شروع کر دیتے تھے، اور یہاں تک نوبت پہنچاتے تھے کہ تہذیب و شایستگی آنکھیں بند کر لیتی تھی، ظہیر وغیرہ کے کلام میں سیکڑوں قطعے اور قصائد ہیں، جن میں اس درجہ کا گدایانہ ابرام ہے کہ ان کو دیکھکر شرم آتی ہے، خواجہ صاحب اس سفلہ پن سے بری ہیں، وہ مدح لکھتے ہیں، صلہ ملا تو بہتر ورنہ یہ کہہ کے چپ ہو جاتے ہیں کہ تقدیر میں نہ تھا، کبھی کبھی ہلکا سا تقاضا بھی کرتے ہیں لیکن پیرایہ نہایت لطیف ہوتا ہے، ایک قطعہ میں فرماتے ہیں،

بہ سمع خواجہ رسان ای رفیق وقت شناس | بہ خلوتے کہ دراں اجنبی صبا باشد
لطیفہ بہ میان آر و خوش بخندانش | بہ نکتہ کہ دلش را دراں رضا باشد
پس آنگہے ز کرم ایں قدر بپرس بہ لطف | کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

ایک اور قطعہ میں کس لطف سے کنایہ کیا ہے،

دوش در خواب چناں دید خیالم کہ سحر | گذر افتاد بر اصطبل شہم پنہانی
بستہ بر آخور او استر من جو می خورد | توبرہ افشاند و بمن گفت مرا میدانی
ہیچ تعبیر نمی دانمش ایں خواب کہ چیست | تو بفرمائے کہ در فہم ندادی ثانی

(حاشیہ: اصطبل، خچر)

یعنی میں نے کل خواب دیکھا کہ میرا گذر شاہی اصطبل خانے کی طرف ہوا، وہاں میرا خچر جو کھارہا تھا، مجھ کو دیکھ کر اس نے توبڑہ کا رخ میری طرف کر کے جھاڑا، اور کہا کہ کیوں

مجھ کو پہچانتے ہو، اس خواب کی مجھ کو کچھ تعبیر نہیں معلوم ہوتی، آپ بڑے نکتہ فہم ہیں آپ ہی بتائیں کہ اس کی تعبیر کیا ہے،، مطلب یہ کہ گھوڑے کے دانے چارے کا سامان کر دیجئے''

معاشرت | ان کے اشعار اور جستہ جستہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سادگی اور آزادی سے بسر کرتے تھے، حافظ قرآن تھے، قرآن مجید کے نکات اور حقائق پر درس دیتے تھے، لیکن با این ہمہ اظہار تقدس سے نہایت نفرت رکھتے تھے، صاف دل اور بے تکلف تھے، جو دل میں تھا، وہی زبان پر تھا، کوئی برائی کرتے تو ریاکاری کے پردے میں چھپا کر نہ کرتے، رکناباد جو ایک چشمہ ہے، شیراز کی مشہور سیرگاہ ہے، اب تو محض فداسی نہر رہ گئی ہے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں وسیع چشمہ ہوگا، اس کے کنارے بیٹھکر عالم آب کا لطف اٹھاتے تھے، دوست احباب جمع ہوتے، ہر قسم کی صحبتیں رہتیں، اکثر اشعار میں مزے لے لے کر اس کا ذکر کرتے ہیں،

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　کنار آب رکناباد و گلگشت مصلا را

رکناباد کے منبع کا نام اللہ اکبر ہے، اس کا بھی ذکر جا بجا کرتے ہیں،

فرق است ز آب خضر کہ ظلمات جای اوست　　تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

جو ارباب کرم ان سے اچھا سلوک کرتے تھے، اکثر غزلوں میں ان کا ذکر احسانمندی کے ساتھ کرتے ہیں، یہ طریقہ ان کا خاص انداز ہے،

بخواہ جام صبوحی بہ یاد آصف عہد　　وزیر ملک سلیمان عماد بن محمود

ع　چہ غم دارم چو در عالم قوام الدین حسن دارم

دریای اخضر فلک و کشتی ہلال　　ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

مطرب بہ پردہ سازی، شاید اگر بخواند　　از طرز شعر حافظ در بزم شاہزادہ

تو بہ این نازکی و سرکشی اے شمع چو گل | لائق بزمگہ خواجہ جلال الدینے

با تو گرزیں پس فلک خواری کند | باز گو در حضرت دادارے رے

خسرو آفاق بخشش کز عطا | نامۂ حاتم زنامش گشت طے

از برائے صید دل در گردنم زنجیر زلف | چوں کمند خسرو مالک رقاب انداختی

نصرت الدین شاہ یحییٰ آنکہ تاج آفتاب | از سر تعظیم و قدرت در تراب انداختی

اے در رخ تو پیدا انوار بادشاہی | در فکرت تو پنہاں صد حکمتِ الٰہی

عمرے است بادشاہا کز می تہی است جامم | اینک ز بندہ دعویٰ، در محتسب گواہی

انصاف پسندی | خواجہ صاحب اگرچہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ اُن کے تمام ہمعصر شعراء غزل گوئی میں ان کے سامنے ہیچ تھے، تاہم وہ سب کو نہایت ادب سے یاد کرتے ہیں، بلکہ اپنے آپ کو ان کا پیرو کہتے ہیں، خواجہ کرمانی کی نسبت کہتے ہیں،

استاد غزل سعدی است پیشِ ہمہ کس امّا | دارد غزل حافظ طرزِ روشِ خواجو

فخر کے جوش میں آکر کہتے ہیں،

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعر سلمان است | کہ شعر حافظ شیراز بہ زشعر ظہیر

لیکن انصاف سے دیکھو تو یہ ان کے لئے ننگ ہے، ظہیر کو غزل میں ان سے کیا نسبت؟

اس زمانہ میں کمال خجند مشہور شاعر اور صاحبِ کمال تھے، خواجہ صاحب سے ان سے بہت راہ و رسم تھی، وہ خواجہ صاحب کی غزلیں منگوایا کرتے اور اپنا کلام اُن کو بھیجتے، ایک دفعہ اپنی یہ غزل بھیجی،

گفت یار از غیر ما پوشاں نظر گفتم بہ چشم | وانگہے درزدیدہ در ما می نگر گفتم بہ چشم

غزل میں یہ شعر بھی تھا،

گفت اگر سر در بیابان غم خواہی نہاد تشنگان را فردہ از ما بر گفتم بہ چشم

خواجہ صاحب اس شعر پر پہونچے، تو ان پر حالت طاری ہوئی، افاقہ کے بعد کہا کہ واقعی اس شخص کا پایہ بہت بلند ہے،[1]

کلام | تذکرہ می خانہ میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کا دیوان صرف دو برس میں تیار ہوا، لیکن یہ قطعاً غلط ہے، خلاف قیاس ہونے کے علاوہ غزلوں میں جا بجا جن لوگوں کے نام آتے ہیں ان کے زمانوں میں برسوں کا آگا پیچھا ہے،

خواجہ صاحب کی شہرت اگرچہ صرف غزل میں ہے لیکن انھوں نے قصائد اور مثنویاں بھی لکھی ہیں، اور گو وہ تعداد میں کم ہیں، لیکن ان سے اندازہ ہوتا ہی کہ شاعری کے تمام اصناف پر ان کو قدرت حاصل تھی، عام خیال ہے کہ جو لوگ غزل اچھی لکھتے ہیں، قصیدہ اور مثنوی اچھی نہیں لکھتے لیکن خواجہ صاحب کے قصیدے بھی کچھ کم نہیں اور مثنوی میں تو وہ صفائی لطافت اور زور ہے کہ نظامی اور سعدی کا دھوکہ ہوتا ہی،

سر فتنہ دارد دگر روزگار من و مستی و فتنۂ چشم یار

فریب جہاں قصۂ روشن است بہ بیں تا چہ زاید، شب آبستن است

ہماں مرحلہ است ایں بیابان دور کہ گم شد درو لشکر سلم و تور

ہماں منزل است ایں جہانِ خراب کہ دیدا ست ایوانِ افراسیاب

چہ خوش گفت جمشید با تاج و گنج کہ یک جو نیرزد سرائے سپنج

مغنی کجائی بہ گلبانگ رود بہ یاد آور آں خسروانی سرود

مغنی بزن چنگ بر ارغنوں بپرداز دلم فکر دنیائے دوں

[1] دولت شاہ تذکرہ کمال خجندی،

چناں برکش آہنگ این داورے | کہ ناہید چنگی برقص آورے
مغنی دف و چنگ را ساز دہ | بہ یارانِ خوش نغمہ آواز دہ
مغنی کجائی نوائے بزن | بہ یکتائی او دوتائے بزن
بیا ساقی این نکتہ بشنو زنے | کہ یک جرعۂ بہ ز دیہیم کے
بیا ساقی آں آب اندیشہ سوز | کہ گر شیر نوشد شود بیشہ سوز
بیا ساقی آں آتشِ تابناک | کہ در دشت می جویدش زیر خاک
بدہ تا بگوید ز آواز نے | کہ جمشید کے بود و کاؤس کے
می دہ کہ بدنام خواہم شدن | خرابِ میِ و جام خواہم شدن
بیا ساقیاے کہ تادم زنیم | قلم بر سر ہر دو عالم زنیم
سبک باش و رطل گرانم بدہ | دگر فاش نتواں نہانم بدہ
کہ این چرخ وایں انجم و آبنوس | بسے یاد دارد ز بہرام و طوس
بدہ ساقی آں آب افسردہ را | بیا زندہ ساز ایں دلِ مردہ را
کہ ہر پارہ خشتے کہ بر منظری است | سر کیقبادی و اسکندری است
ہر آں گل کہ در گلستانی بود | مہ عارض دلستانی بود
ہر آں شاخ سروے کہ در گلشنے است | قد دلبر و زلفِ سیمیں تنے است

خواجہ صاحب اگرچہ قصیدہ اور مثنوی میں بھی اساتذہ سے پیچھے نہیں لیکن انکا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے، یہ عموماً مسلّم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں ان کا ہمسر نہ ہو سکا، متوسطین اور متاخرین، غزل کے بزم آرا ہیں، لیکن ان کو تسلیم ہے کہ خواجہ صاحب کا انداز کسی کو نصیب نہیں ہوا،

صائب | رواست صائب اگر نیست از رہ دعویٰ | تتبع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی است

" | صائب چہ تواں کرد بہ تکلیف عزیزاں | ورنہ طرف خواجہ شدن بے بصری بود

" | ع چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد،

سلیم | سلیم معتقد نظم خواجہ حافظ باش | کہ نشہ بیش بود در شراب شیرازی

عرفی نے کبھی غزل میں کسی استاد کا نام نہیں لیا، تاہم کہتا ہے،

عرفی | برآں تتبع حافظ رواست چوں عرفی | کہ دل یکا وود در و سخنوری داند

خواجہ صاحب کی غزل گوئی

غزل کی بنیاد سعدی نے ڈالی اور امیر خسرو اور حسن نے اس کو ترقی دی، ساتویں صدی کا چمن انہی بلبلوں کے زمزموں سے گونج رہا تھا کہ سلمان ساؤجی اور خواجو کرمانی نے نغمہ سنجی شروع کی، سعدی اور خسرو کے آگے اگرچہ ان کو فروغ نہیں ہو سکتا تھا، لیکن یہ دونوں، اور اصناف سخن یعنی قصیدہ اور مثنوی میں اس قدر ممتاز اور نام آور تھے کہ اس اثر نے غزل میں بھی کام دیا، اس کے ساتھ ان لوگوں نے غزل میں کچھ جدتیں بھی پیدا کیں جو زمانہ کے مذاق کے موافق تھیں، اس لئے اور بھی مدد ملی، اس سے بڑھ کر یہ کہ سلطنت نے بھی ساتھ دیا، سلمان بغداد کے ملک الشعرا اور خواجو ابو اسحٰق فرماں روائے شیراز کے دربار میں سب سے ممتاز تھے،

اساتذہ کا تتبع | غرض خواجہ حافظ نے آنکھیں کھولیں تو سلمان اور خواجو کا رنگ ملک پر چھایا ہوا تھا، خواجہ صاحب نے دونوں کا زمانہ پایا تھا، اور اتفاق یہ کہ خواجو نے جب ۷۵۳ھ میں شیراز میں وفات پائی، تو دفن اسی مقام یعنی اللہ اکبر میں ہوئے جو حافظ کی خاص سیرگاہ تھی، اور جس کی شان میں فرماتے ہیں،

فرق است ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست | تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

خواجہ صاحب نے غزل گوئی شروع کی تو خواجہ کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا چنانچہ خود فرماتے ہیں، ع

دارد سخن حافظ طرز وروش خواجو

جو غزلیں ہم طرح ہیں ان میں جا بجا مصرعے تک لڑ گئے ہیں اور مضامین اور ترکیبیں تو کثرت سے متوارد ہیں، سلمان کی غزلوں پر بھی اکثر غزلیں ہیں اور ان سے بھی اس قدر جا بجا توارد ہے کہ لوگوں کو دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے یہانتک کہ بعض بعض غزلیں دونوں کے دیوان میں موجود ہیں، اور ایک نقطہ کا فرق نہیں، اسی بنا پر بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ کاتبوں نے حافظ، خواجو اور سلمان کے دیوانوں میں نہایت خلط ملط کر دیا ہے،

خواجہ صاحب کے کلام کا خواجو وغیرہ سے موازنہ کرنا اگرچہ اس لحاظ سے غیر ضروری ہے کہ آج کسی کو حافظ کی ترجیح میں کلام نہیں، بلکہ خواجہ صاحب کی غزلوں کے مقابلہ میں خواجو اور سلمان کی غزلوں کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، لیکن شاعری کی تاریخ کا یہ ایک ضروری باب ہے کہ شاعری کی ترقی کے تدریجی مدارج دکھائے جائیں، یہ ایک واقعہ ہے کہ سعدی، خواجو اور سلمان ہی کے خاکے ہیں، جن پر حافظ نے نقش آرائیاں کی ہیں، اس لئے انکے باہمی امتیاز اور تدریجی ترقی کا دکھانا شعر العجم کا ضروری فرض ہے،

سعدی اور خسرو اور حسن تک غزل میں زیادہ تر عشق و عاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کرتے تھے، خواجو نے دنیا کی بے ثباتی، وسعت مشرب اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا، اکثر غزلیں پوری کی پوری صرف دنیا کی بے ثباتی پر ہیں مثلاً یہ غزل

پیش صاحب نظران ملک سلیماں باد است ۔۔۔ بلکہ آن است سلیماں کہ زملک آزاد است

ایں کہ گویند کہ بر آب نہادہ ست جہاں ۔۔۔ مشنو اے خواجہ کہ چوں درنگری بر باد است

یا مثلاً یہ غزل

مشو بہ ملکِ سلیمان و مالِ قارون شاد — کہ مال و ملک بود دررہ حقیقت باد

خواجہ صاحب نے بھی انہی مضامین پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے،

سلمان کا خاص مذاق، مضمون آفرینی، جدت تشبیہ، اور صنائع لفظی ہے، خواجہ حافظ بھی ان چیزوں کو لیتے ہیں، لیکن یہ اُن کا خاص انداز نہیں، سعدی، خسرو، اور حسن کا کلام ہمہ تن عشق، سوز و گداز، بیان شوق، نا امیدی اور حسرت ہے، خواجہ صاحب سعدی کی بھی تقلید کرتے ہیں، چنانچہ اکثر غزلیں ان کی غزلوں پہ لکھی ہیں، لیکن وہ فطرۃً شگفتہ مزاج اور ولولہ خیز طبیعت رکھتے تھے، اس لیے درد و غم کے نوحے ان سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتے، خواجہ صاحب نے سعدی، خواجو، سلمان کے جواب میں جو غزلیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض ہم اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کے فرقِ مراتب کا اندازہ ہو سکے،

حافظ	خواجو
دوش از مسجد سوے مے خانہ آمد پیر ما	خرقہ، رہنِ خانۂ خمّار دارد پیر ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما	اے ہمہ رنداں مرید پیر ساغر گیر ما

خواجہ صاحب کا مطلع ہر پہلو سے خواجو کے مطلع سے بڑھا ہوا ہے، اور یہ محتاج اظہار نہیں،

حافظ	خواجو
در خراباتِ مغاں ما نیز ہمدستاں شدیم	گر شدیم از بادہ، بدنام جہاں تدبیر چیست
کایں چنیں رفت ست از روز ازل تقدیر ما	ہمچنیں رفت است از روز ازل تقدیر ما

خواجہ صاحب نے خواجو ہی کے مضمون اور الفاظ کو الٹ پلٹ کر دیا ہے، اور

افسوس ہے کہ کچھ بھی ترقی نہیں کی، دوسرا مصرع تو حرف حرف خواجو ہی کا مصرع ہی پہلا مصرع خواجو کا زیادہ برجستہ اور صاف ہی اس کے ساتھ تدبیر اور تقدیر کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے آیا ہے، خواجہ صاحب نے یہ حسن بھی کھو دیا، خواجو کے مصرع کا مطلب یہ ہی' کہ شراب نے اگر ہم کو رسوا کر دیا تو علاج کیا؟ تقدیر یونہی تھی، خواجہ صاحب کہتے ہیں ہم کو بھی مغوں کا ساتھ دینا پڑا، تقدیر میں یہی لکھا تھا، خواجہ صاحب کو مضمون کے لحاظ سے بھی کچھ ترجیح نہیں،

خواجو	حافظ
ما دلِ دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم	عقل اگر داند کہ دل در بندِ زلفش چون خوش است
اے بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیرِ ما	عاقلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجہ صاحب نے یہ بات اضافہ کی کہ عاقلوں کے دیوانۂ زنجیر ہونے کی وجہ ظاہر کر دی، یعنی یہ کہ زلف کی قید کس قدر پر لطف ہے، اس کے علاوہ خواجہ صاحب کا پہلا مصرع زیادہ صاف اور ڈھلا ہوا ہی، لیکن خواجو کے مصرع میں ایک خاص نکتہ ہے جو خواجہ صاحب کے ہاں نہیں، خواجو کہتا ہے کہ میرا دیوانہ دل زنجیر زلف میں پھنس گیا، یہ وہ زنجیر ہے کہ عاقل بھی اس کے دیوانے بن گئے، جس سے اس بات کی معذرت نکلتی ہے، کہ جب عقلا اس زنجیر میں پھنستے ہیں تو دیوانہ کا پھنسنا کیا تعجب ہے؟ اس کے علاوہ دیوانوں کو عموماً زنجیر میں باندھتے ہیں، اس لئے دل کا زلف میں گرفتار ہونا قدرتی بات تھی، خواجہ صاحب نے دل کی دیوانگی کا کچھ ذکر نہیں کیا، اس لئے گرفتاری کی کوئی معقول وجہ نہیں، خواجو کے ہاں عاقل و دیوانہ کے لفظی تقابل نے جو لطف پیدا کیا ہی، خواجہ صاحب کے ہاں وہ بھی نہیں،

خواجو	حافظ
از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو	تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جاناں خموش
کز کمانِ بزم زخمش، سخت باشد تیر ما	رحم کن بر جان خود، پرہیز کن از تیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجہ صاحب نے کوئی ترقی نہیں دی، بلکہ اس کے لطف کو کم کر دیا، خواجو نے معشوق سے صرف اس قدر کہا تھا کہ "غافل مشو"، خواجہ صاحب "خاموش اور رحم کن بر جان خود"، سے معشوق کو خطاب کرتے ہیں جو آدابِ عشق کے بالکل خلاف ہے،

خواجو	حافظ
دیا صبا خبرے کن مرا ازاں کہ تو دانی	نسیم صبح سعادت برآں نشاں کہ تو دانی
بداں زمیں گذرے کن بداں زماں کہ تو دانی	گذر بکوی فلاں کن دراں زماں کہ تو دانی
چو مرغ در طیران آئی و چوں بہ اوج رسی	تو پیک حضرت شاہی مراد دو دیدہ بہ راہست
نزول ساز دراں آشیاں کہ تو دانی	بہ مردمی نہ بفرمان ببر ہراں کہ تو دانی
چناں مرد کہ غبارے بدو رسد ز گذارت	بگو کہ جانِ ضعیفم، ز دست رفت خدارا
بداں طرف چو رسیدی چناں بداں کہ تو دانی	ز لعل روح فزات بہ بخش ازاں کہ تو دانی
	من ایں دو حرف نوشتم چناں کہ غیر نہ دانست
	تو ہم ز روی کرامت بخواں چناں کہ تو دانی

دونوں نے صبا کو قاصد بنایا ہے اور اس کو ہدایتیں کی ہیں، خواجو نے صبا کو مرغ سے اور معشوق کے گھر کو آشیانہ سے تشبیہ دیکر بدمزگی پیدا کر دی، لیکن اخیر کا شعر نہایت لطیف ہے، یعنی اے صبا اس طرح آہستہ اور مودب جانا کہ گرد تک نہ اٹھنے پائے

اور بنانے کی کیا حاجت ہے؟ تو تو خود آداب داں ہے جیسا مناسب سمجھنا کرنا،

خواجہ صاحب کا مطلع نہایت برجستہ ہے، صبا کے بجائے نسیم اور اس پر صبحِ سعادت کی قید نے لطف پیدا کر دیا ہے، خواجو کے مصرع میں زمین و زماں کا جو لفظی تناسب تھا، تکلف سے خالی نہ تھا، اس لئے خواجہ صاحب نے اس کو اڑا دیا بداں زمین" کے بجائے "بہ کوی فلاں" کا کنایہ زیادہ لطیف ہے، دوسرا شعر بھی نہایت لطیف ہی، کہتے ہیں کہ تو شاہی قاصد ہے، میں تجھکو حکم نہیں دے سکتا، البتہ مروت اور انسانیت کے اقتضا سے توقع رکھتا ہوں، اخیر شعر اور زیادہ پرمزہ ہے معشوق سے کہتے ہیں، کہ میں نے یہ دو سطریں اس طرح چھپا کر لکھی ہیں کہ غیروں کو خبر نہیں ہونے پائی، تم بھی اسی طرح پڑھنا، جیسا مناسب ہو، یعنی کسی کو خبر نہ ہونے پائے،

خواجو	حافظ
دل دریں پیر زنِ عشوہ گرِ دہر مبند	مجو درستی عہد از جہانِ بے بنیاد
کیں عروسے است کہ در عہد بسے داماد است	کہ ایں عجوزہ، عروسِ ہزار داماد است

مضمون وہی ہے، لیکن خواجہ صاحب کی بندش میں ذرا حسن ہے، پہلے مصرع میں صرف اس قدر کہنا چاہئے، کہ دنیا میں دل نہ لگاؤ پھر اسکی وجہ بتانی چاہئے، کہ یہ ایک ایسی عجوزہ ہے جو ہزاروں کے نکاح میں ہی، خواجو نے پہلے ہی کہدیا کہ عجوزۂ دہر سے دل نہ لگاؤ، حالانکہ جب پہلے ہی عجوزہ کہہ دیا تو اس دلیل کی ضرورت نہیں رہی کہ وہ کثیر الازواج ہے، کیونکہ بڑھیا سے یوں بھی انسان کو محبت نہیں ہوتی، خواجہ صاحب نے پہلے دنیا کی برائی کو مطلق حیثیت سے بیان کیا پھر ایک ساتھ نفرت کی دو وجہیں بتائیں یعنی یہ بوڑھی ہے اور کثیر الازواج بھی ہے،

حافظ	خواجو
ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار چہ مست	منزل ار یار قرین است چہ دوزخ چہ بہشت
ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت	سجدہ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت

خواجو کے شعر کو خواجہ صاحب کے شعر پر ترجیح ہے، اول تو خواجو نے مطلع میں جس میں قافیہ کی پابندی ہو جاتی ہے، ایسے وسیع مضمون کو ادا کیا ہے، اس کے ساتھ دونوں عالم کی دونوں چیزیں لے لیں، یعنی دوزخ اور بہشت، مسجد اور کنشت، ان سب کے علاوہ مسجد کی تنکیر اور تعمیم اور نیاز کی قید نے جو لطف پیدا کیا ہے، خواجہ صاحب کے ہاں مطلق نہیں، خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ مسجد اور گرجا دونوں عشق کے گھر ہیں، اور ایک ہی چیز ہیں خواجو دونوں کو مخالف تسلیم کر کے کہتا ہے کہ سجدۂ نیاز وہ چیز ہے کہ مخالف اور موافق ہر جگہ ادا کیا جا سکتا ہے، اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ سجدۂ نیاز گرجا میں بھی ادا کیا جائے تو مسجد بن جائے

حافظ	خواجو
عشق تو در وجودم و مہر تو در دلم	کے برکنم دل از رخ جاناں کہ مہر او
با شیر در بدن شد و با جاں بدر شود	با شیر در دل آمد و با جان بدر شود

خواجہ صاحب نے جس طرح اس مضمون کو ترقی دی ہے محتاج اظہار نہیں،

خواجو اور خواجہ صاحب کی غزلیں اکثر ہم طرح ہیں، اختصار کے لحاظ سے ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں،

خواجہ صاحب نے سلمان کی اکثر غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں، جن میں کہیں سلمان کی تقلید کی ہے، کہیں سلمان کے مضمون کو لے کر زیادہ دلکش پیرایہ میں ادا کیا ہے، کہیں سلمان کے آئینہ کو زیادہ جلا دیدی ہے،

حافظ	سلمان
عید است و موسمِ گل ساقی بیار بادہ	آوازۂ جمالت تا در جہاں فتادہ
ہنگامِ گل کہ دیدہ است بے می قدح نہادہ	خلقے بہ جستجویت سر در جہاں نہادہ

دونوں مطلع بالکل الگ ہیں، ان میں کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا،

حافظ	سلمان
گل رفت اے حریفاں غافل چرا نشینید	سودای زہد خشکم بر باد دادہ حاصل
بے بانگ رود و چنگے، بے یار و جام و بادہ	مطرب بزن ترانہ، ساقی بیار بادہ

سلمان کا دوسرا مصرع نہایت برجستہ اور مستانہ ہے،

حافظ	سلمان
زیں زہد و پارسائی بگرفت خاطرِ من	مائیم بستہ دل را در لعل دلکشایت
ساقی پیالہ دہ تا دل شود کشادہ	آں لب بہ خندہ بکشا تا دل شود کشادہ

صنعت اضداد کا دونوں نے لحاظ رکھا ہے، لیکن سلمان کے الفاظ زیادہ صاف ہیں، یعنی بستن و کشادن، گرفتن اور کشادن میں بھی گو یہی صنعت ہے، لیکن گرفتن کے یہ اصلی معنی نہیں ہیں، بلکہ محاورہ نے یہ معنی پیدا کئے ہیں، اس کے علاوہ دل کے کھلنے کی توجیہ سلمان کے ہاں لفظاً اور معنیً دونوں لحاظ سے زیادہ روشن ہے، یعنی تو لب کھول تو ہمارا دل بھی کھلے، کیونکہ ہمارا دل تیرے لبوں میں بندھا ہوا ہے، پیالہ سے دل کھلنے میں یہ بات نہیں

حافظ	سلمان
در مجلسِ صبوحی، دانی؟ چہ خوش نماید	سودائیانِ زلفت گرد تو حلقہ بستہ
عکس عذار ساقی بر جامِ می فتادہ	شوریدگانِ مویت در یک دگر فتادہ

مضمون کے لحاظ سے دونوں شعر الگ ہیں، البتہ قافیہ مشترک ہے اور سلمان کے ہاں اچھا بندھا ہے، یوں بھی سلمان کا شعر اچھا ہے،

سعدیؒ و حافظ

شیخ سعدیؒ کے جواب میں بھی گو اکثر غزلیں ہیں، لیکن درحقیقت دونوں کے راستے الگ الگ ہیں، اس لئے ان میں موازنہ نہیں ہو سکتا، تاہم متعدد مضامین خواجہ صاحب نے شیخ سعدیؒ سے لئے ہیں، لیکن ان کے اسلوب کو اس طرح بدل دیا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ موتی انہی قطروں کے بنے ہیں، مثالیں جدت اسلوب کے عنوان میں آئیں گی،

خواجہ صاحب کی خصوصیات | تم نے دیکھا، خواجہ صاحب اپنے اساتذہ یا حریفوں سے طرحی غزلوں میں چنداں بلند رتبہ نہیں ہیں، ان کی شاعری کے مہمات مضامین بھی ان کا ذاتی سرمایہ نہیں، بلکہ خیام کے ابر قلم کے رشحات ہیں، بایں ہمہ اُن کی غزلوں نے دنیا میں جو غلغلہ برپا کر دیا، اس کے آگے سعدیؒ، خسرو، خواجو، سلمان کی آوازیں بالکل پست ہو گئیں، اس کا کچھ سبب ہوگا، اور وہی خواجہ صاحب کی خصوصیات شاعری ہیں، یہ خصوصیات اگرچہ درحقیقت ذوقی اور وجدانی ہیں جو صرف مذاقِ سلیم سے تعلق رکھتے ہیں، تاہم جس قدر ضبط تحریر میں آسکتا ہے وہ حسب ذیل ہے،

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری میں متعدد ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے، ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لیں تو اوروں کے ہاں نکل آئے، لیکن خواجہ صاحب کا کلام ع "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہے،

ان میں بعض اوصاف ایسے بھی ہیں جو اوروں کے کلام میں اس درجہ تک نہیں پائے جاتے ہیں مثلاً روانی، برجستگی اور صفائی، یہ وصف سعدیؒ اور خسرو کا بھی مابہ الامتیاز ہے لیکن یہ ایسی چیز ہے، جس کے مدارج کی حد نہیں، ممکن ہے کہ ایک شعر خود نہایت رواں اور صاف و شستہ ہو، لیکن ایک اور شعر اس سے بھی بڑھ کر ہو، اور اس سے

بھی بڑھ کر کوئی اور شعر ہو، جس طرح نغمہ اور حسن کہ ان کے مدارجِ ترقی کی کوئی حد نہیں،

ایک اور چیز جو خواجہ صاحب کی شاعری کا نہایت نمایاں وصف ہی جوشِ بیان ہے، اسی طرح تنوعِ مضامین بھی، ان سے پہلے اس قدر نہ تھا، چنانچہ ہم اون کے کلام کے تمام اوصاف کو الگ الگ عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں،

جوشِ بیان فارسی شاعری، باوجود ہزاروں گوناگوں اوصاف اور خیالات کے جوشِ بیان سے خالی ہے، فردوسی اور نظامی کے ہاں خاص خاص موقعوں پر جوشِ بیان کا پورا زور ہے لیکن وہ اوروں کے خیالات اور واردات ہیں، خود شاعر کے حالات اور جذبات نہیں، بخلاف اس کے خواجہ حافظ کے کلام میں جو جذبات ہیں، وہ خود ان کے واردات اور حالات ہیں، اس لئے اُن کو وہ اس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے جوشِ بیان کے لئے کسی مضمون یا کسی خیال کی خصوصیت نہیں، ہر مضمون اور ہر خیال جوش کے ساتھ ظاہر کیا جا سکتا ہے، البتہ اختلافِ نوعیت کی وجہ سے صورتیں بدل جاتی ہیں مثلاً شاعر جوشِ مسرت کا بیان کرتا ہے تو اس انداز سے کرتا ہے کہ گویا آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، قہر اور غضب کا بیان ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا مرقع الٹ دیگا، دنیا کی بے ثباتی کا مذکور ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالم ہیچ ہے، غصہ اور غضب کا مضمون ہے تو نظر آتا ہے کہ منہ سے انگارے برس رہے ہیں،

خواجہ صاحب نے سیکڑوں گوناگوں خیالات ادا کئے ہیں اور جس خیال کو ادا کیا ہے اس جوش کے ساتھ کیا ہے کہ سننے والے پر وہی اثر طاری ہوجاتا ہے جو خود خواجہ صاحب کے دل میں ہوتا ہے،

اعتمادے نیست بر دورِ جہاں	بلکہ بر گردونِ گرداں نیز ہم	زمانہ کی بے اعتباری
سرودِ مجلسِ جمشید گفتہ اند ایں بود	کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند	
حلقۂ پیرِ مغاں از ازلم در گوش است	ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود	استقلال و ثابت قدمی
در نمازم خمِ ابروئے تو در یاد آمد	حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد	وجد و ذوق
از حدیثِ سخنِ عشق ندیدم خوشتر	یادگارے کہ دریں گنبدِ دوار بماند	فسانۂ عشق کی پائداری
بادہ خور غم مخور و پندِ مقلد مشنو	اعتبارِ سخنِ عام چہ خواہد بودن	واعظوں کے وعظ اور پند کی تحقیر
می ترسم از خرابیِ ایماں کہ می برد	محرابِ ابروئے تو حضورِ نمازِ من	معشوق کی دلفریبی.
زاں پیشتر کہ عالمِ فانی شود خراب	ما را بجامِ بادۂ گلگوں خراب کن	مستی کی تمنا
فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید	دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد	کمال کسی پر محدود نہیں
ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم	از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس	ہمہ تن وفا و محبت ہونا
داستاں در پردہ می گویم و لے	گفتہ خواہد شد بدستاں نیز ہم	اعلانِ راز
محتسب داند کہ حافظ می خورد	آصفِ ملکِ سلیماں نیز ہم	
رنگِ تزویر پیشِ ما نبود	شیرِ سرخیم و افعیِ سیہیم	ظاہر و باطن یکساں ہونا
گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر	تا سحرگہ ز کنارِ تو جواں برخیزم	معشوق کی روح افزائی
ای نورِ چشمِ من سخنے ہست گوش کن	تا ساغرت پُر است بنوشان و نوش کن	جود و کرم کی ترغیب
بس تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات	با دُردکشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد	غریبوں کے ستانے کا انجام
سوزِ آہِ سینۂ سوزانِ من	سوخت ایں افسردگانِ خام را	سوزِ دل کا اثر

جوشِ بیان کا اصلی موقع وہاں آتا ہے، جہاں کسی خاص جذبہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے
مثلاً رنج و غم، فخر و ناز، غیظ و غضب، عشق و محبت،

خواجہ صاحب پر رندی اور سرمستی کا جذبہ غالب تھا، ان کے تمام کلام میں یہ جذبہ اس جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ زندگی میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی، اس کے اندازہ کرنے کے لئے پہلے ایک رند سرمست کی حالت کا تصور باندھو، کہ جب وہ مستی کے جوش وخروش میں ہوتا ہے، تو اس کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہیں، وہ مزے میں آکر بنکارتا ہے کہ مجھ کو نام وننگ کی کچھ پروا نہیں، ساقی پیالہ پر پیالہ دیئے جا، اور کسی سے نہ ڈر، زاہد کیا جانتا ہے کہ جام میں کیا کیا گوناگوں عالم نظر آتے ہیں، مطرب سے کہدو یہ ترانہ گائے کہ تمام دنیا پر میری حکومت ہے، کل خاک میں جانا ہی ہے، آج کیوں نہ عالم میں غلغلہ ڈال دوں، تم مجھے حقیر سمجھتے ہو، شراب خانہ میں آؤ تو تم کو نظر آئے کہ میری کیا شان ہے؟ میرے ہاتھ میں جو پیالہ ہے جمشید کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا، میں شراب آج سے نہیں پیتا، مدت سے آسمان اس غلغلہ سے گونج رہا ہے، صوفی اور واعظ رازدانی کی شیخیاں بگھارتے ہیں، حالانکہ جو کہتے ہیں مجھی سے سن لیا تھا، یہ عالم لطف اٹھانے کے لئے کافی نہیں، آؤ آسمان کی چھت توڑ کر ایک اور نیا عالم بنائیں خواجہ صاحب ان خیالات کو اسی جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں، جس طرح ایک سرمست کے دل میں آتے ہیں،

ابھی یہ بحث چھوڑ دو کہ خواجہ صاحب کی شراب، معرفت کی شراب ہے یا انگور کی مستی دونوں میں ہے، اور یہاں صرف مستی سے غرض ہے،

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

آؤ پھول برسائیں اور شراب پیالہ میں ڈالیں
آسمان کی چھت توڑ ڈالیں اور نئی بنا ڈالیں،

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

اگر غم عاشقوں کے مقابلہ کے لئے فوج تیار کرے، تو ہم اور ساقی دونوں ایکا کرکے اسکی جڑ اکھاڑ کر پھینکدیں

چو در دست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش   که دست افشان غزل خوانیم و پاکوبان سر اندازیم

رند مزے میں آکر جب گاتا ہے تو دونوں طرف ہاتھ جھٹکتا ہے، پاؤں زمین پر دے دے مارتا ہے، سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیتا ہے، یہ شعر بعینہ اس حالت کی تصویر ہے،

ساقی بہ نور بادہ بر افروز جام ما   مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم   اے بیخبر ز لذت شرب مدام ما

ساقیا برخیز و درده جام را   خاک بر سر کن غم ایام را

گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں   ما نمی خواہیم ننگ و نام را

تا زمیخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود   سر ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود

حلقہ پیر مغانم ز ازل در گوش است   ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

بر سر تربت ما چون گذری ہمت خواہ   کہ زیارت گہ رندان جہان خواہد بود

عاقبت منزل ما وادی خاموشان است   حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

حاصل کارگہ کون و مکاں اینہمہ نیست   بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں اینہمہ نیست

ساقی بیار بادہ و با مدعی بگو   انکار ما مکن کہ چنیں جام جم نداشت

خوش وقت رند مست کہ دنیا و آخرت   از دست داد و ہیچ غم بیش و کم نداشت

ما می بہ بانگ چنگ نہ امروز می خوریم   بس دیر شد کہ گنبد چرخ ایں صدا شنید

سر خدا کہ عارف و سالک بکس نگفت   در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

ساقی بیا کہ عشق ندا می کند بلند   کاں کس کہ گفت قصہ ما ہم ز ما شنید

من ترک عشق بازی و ساغر نمی کنم   صد بار توبہ کردم و دیگر نمی کنم

من رند و عاشق و آنگاه توبه	استغفر الله استغفر الله
ما زهد و تقوی کمتر شناسیم	یا جام باده یا قصه کوتاه
شراب و عیش نهان چیست کار بی بنیاد	زدیم بر صف رندان هر چه بادا باد
سخن درست بگویم نمی توانم دید	که می خورند حریفان و من نظاره کنم
گدای میکده ام لیک وقت مستی بین	که ناز بر فلک و حکم بر ستاره کنم
نه قاضیم نه مدرس نه محتسبم نه فقیه	مرا چه کار که منع شراب خواره کنم
با من خاک نشین خیز و سوی میکده آی	تا ببینی که در آن حلقه چه صاحب جاهم
ای خوشا حالت آن مست که در پای حریف	سر و دستار نداند که کدام اندازد
خوش تر از فکر می و جام چه خواهد بودن	چون خبر نیست که انجام چه خواهد بودن
پیر میخانه چه خوش گفت معمای دوش	از خط جام که فرجام چه خواهد بودن
باده خور غم مخور و پند مقلد مشنو	اعتبار سخن عام چه خواهد بودن
غم دنیای دنی چند خوری باده بخور	حیف باشد دل دانا که مشوش باشد
ساقی بیا که شد قدح لاله پر ز می	طامات تا به چند و خرافات تا به کی
شیخم به طنز گفت حرام است می مخور	گفتم بدو که گوش بهر خر نمی کنم
که برد به نزد شاهان ز من گدا پیامی	که بکوی می فروشان دو هزار جم به جامی
صبح است ژاله می چکد از ابر بهمنی	برگ صبوح ساز و بزن جام یک منی
ساقی بهوش باش که غم در کمین ماست	مطرب نگاه دار همین ره که میزنی
بیا که رونق این کارخانه کم نشود	ز زهد همچو تویی یا ز رندی چو منی
ما مرد زهد و توبه و طامات نیستیم	با ما به جام باده صافی خطاب کن

زاں پیشتر کہ عالمِ فانی شود خراب | مارا بہ جام بادۂ گلگوں خراب کن

یہ مضامین کہ دنیا چار دن کی چاندنی ہے، اس کے لئے جھگڑوں اور بکھیڑوں میں پڑنے سے کیا حاصل، کھاؤ پیو لطف اٹھاؤ اور دنیا سے گذر جاؤ، سو سو طرح بندھ چکے ہیں اور خیام کی تمام شاعری کی یہی کائنات ہے لیکن خواجہ صاحب کے یہاں جو جوش بیان پایا جاتا ہے فارسی شاعری اس سے خالی ہے،

شرابِ تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش | کہ تا یکدم بیاسایم ز دنیا و ز شر و شورش

کمند صید بہرامی بیفگن جامِ مے بردار | کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام ست نے گورش (گورخر)

مے دو سالہ و محبوب چار دہ سالہ | ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

دو یار زیرک و از بادہ کہن دو منے | فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

من ایں مقام بہ دنیا و آخرت ندہم | اگرچہ در پیم افتند خلق انجمنے

دنیا کی شان و شوکت، جاہ و جلال، دھوم دھام، ان کو للچانا چاہتے ہیں، لیکن ان کے دل سے یہ صدا آتی ہے: کہ تا کے؟ یہ نیرنگیاں کب تک؟ اس جھوٹے طلسم کے لئے زندگی کو کیوں آلودہ کیا جائے،

بس کن ز کبر و ناز کہ دیدست روزگار | چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

حاصل کار گہ کون و مکاں اینہمہ نیست | بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں اینہمہ نیست

بفشاں جرعۂ بر خاک و حالِ اہلِ شوکت بیں | کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

گرہ بہ باد مزن گرچہ بر مراد وزد | کہ ایں سخن بہ مثل باد با سلیماں گفت

یہ فلسفہ خواجہ صاحب پر اس قدر چھا گیا تھا کہ بوریائے فقر انکو مسند جمشید نظر آتا تھا، وہ خود اس خیال میں مست تھے اور چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اس عالم کا لطف اٹھائیں،

وہ مناظر قدرت سے، بہار سے، آب رواں سے، سبزہ و مرغزار سے لطف اٹھاتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ خوش عیشی کا یہ عالم ہر شخص کو نصیب ہو سکتا ہے، اس بنا پر وہ تمام دنیا کو خوش عیشی کے فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں، یونان میں اپکیورس کی بھی یہی تعلیم تھی، لیکن وہ فلسفی تھا، اس لئے جو کچھ کہتا تھا فلسفہ کے انداز میں کہتا تھا، خواجہ صاحب شاعر تھے اور فطری شاعر تھے، اس لئے اُنھوں نے خوش عیشی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ زمین سے آسمان تک جوشِ مسرت سے لبریز نظر آتا ہے اور یہی شاعری کا اصلی کمال ہے،

عید است ساقیا قدحِ پُر شراب کن ۔۔۔ دورِ فلک درنگ ندارد شتاب کن
بنوش بادہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند ۔۔۔ چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند
دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد ۔۔۔ بہ می بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمی ارزد
شکوہ تاجِ سلطانی کہ بیم جاں درو درج است ۔۔۔ کلاہ دلکش است اما بہ دردِ سر نمی ارزد
غم دنیائے دنی چند خوری بادہ بخور ۔۔۔ حیف باشد دلِ دانا کہ مشوش باشد
خوشتر از فکر می و جام چہ خواہد بودن ۔۔۔ چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

بہار سے لطف اٹھاتے ہیں،

نفس بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد ۔۔۔ عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد
ارغواں جامِ عقیقی بہ سمن خواہد داد ۔۔۔ چشم نرگس بہ شقائق نگراں خواہد شد
مطربا مجلس انس است غزل خواں و سرود ۔۔۔ چند گوئی کہ چنیں رست و چناں خواہد شد
بلبل ز شاخِ سرو بہ گلبانگ پہلوی ۔۔۔ می خواند دوش درسِ مقاماتِ معنوی
مرغانِ باغ قافیہ سنجند و بذلہ گو ۔۔۔ تا خواجہ می خورد بہ غزلہائے پہلوی
درویشم و گدا و برابر نمی کنم ۔۔۔ پشمیں کلاہ خویش بہ صد تاجِ خسروی

خوش فرشِ بوریا و گدائی و خواب امن | کیں عیش نیست درخورا ورنگِ خسروی
آخرالامر گل کوزہ گراں خواہی شد | حالیا فکرِ سبو کن کہ پُر از بادہ کنی

اے کہ در کوے خرابات مقامے داری | جم وقت خودی ار دست بہ جامے داری
اے کہ با زلف و رخِ یار گذاری شب و روز | فرصتت باد کہ خوش عیش دو امے داری

می خواہ و گل افشاں کن از دہر چہ می جوئی | ایں گفت سحرگہ گل بلبل تو چہ می گوئی
مسند بہ گلستاں بر شاہد و ساقی را | لب گیری و رخ بوسی می نوشی و گل بوئی

خواجہ صاحب کے اس خاص کمال (جوشِ بیان) کا اندازہ اس وقت اچھی طرح ہو سکتا ہے، جب انہی مضامین کے متعلق اور اساتذہ کے کلام کا موازنہ کیا جائے نمونہ کے لئے ہم صرف چند شعروں پر اکتفا کرتے ہیں،

حافظ	سلمان
عاشق و رند نظر بازم و میگویم فاش	رندی و عاشقی و قلاشی
تا بدانی کہ بہ چندیں ہنر آراستہ ام	ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہاست
راز درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس	دروں صافی ز اہل اصلاح در نہد جوی
کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را	کہ ایں نشانہ رنداں درد آشام است
گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں	مکن ملامت رنداں دگر بہ بدنامی
ما نمی خواہیم ننگ و نام را	کہ ہر چہ پیش تو ننگ ست نزد ما نام است
جلوہ بر من مفروش ای ملک الحاج کہ تو	غرض از کعبہ و بتخانہ توئی سلماں را
خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم	حکیم خانہ بے خانہ خدا باید رفت
فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم	من از آں روز کہ در بند توام آزادم

حافظ	سلمان
بندۂ عشقم واز ہر دو جہان آزادم	بادشاہم چو بدست تو اسیر افتادم
یارب ایں باکہ تواں گفت کہ آں نوش لب	ای گنج نوشدار و ورخستگان نظر کن[1]
کشت مارا و دم عیسیِ مریم با اوست	مرہم بدستت مارا مجروح می گذاری

بدیع الاسلوبی یعنی جدت و خوبی ادا | اکثر مضامین ایسے ہیں جو مدتوں سے بندھتے آتے تھے پابند ہے نہ تھے لیکن بجائے خود معمولی مضمون تھے، جن میں کوئی دلفریبی نہ تھی، خواجہ صاحب کے حسنِ اسلوب اور جدت ادا نے اس کو نہایت دلآویز اور لطیف کر دیا، مثلاً معشوق کی آنکھ کو سب مخمور، سرشار اور مست کہتے آئے ہیں خواجہ صاحب اسی بات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

ہر کس کہ بدید چشم او گفت کو محتسبے کہ مست گیرد

یعنی جس نے اس کی آنکھ دیکھی بول اٹھا کہ کہیں محتسب تو نہیں کہ مست کو گرفتار کرے،

معشوق کی زلف کو بنفشہ پر ترجیح دینا معمولی بات ہے، خواجہ صاحب اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

بنفشہ طرۂ مفتولِ خود گرہ میزد صبا حکایتِ زلفِ تو در میاں انداخت

یہ مضمون اس طرح ادا کیا ہے کہ تصویر کھینچ دی ہے، بنفشہ گویا ایک حسین اور جمیلہ ہے اس کی زلفیں نہایت خوبصورت اور گھونگھر والی ہیں، وہ بڑے ناز و انداز سے بیٹھی ہوئی چوٹی میں گرہیں لگا رہی ہے، اتنے میں کہیں سے صبا آنکلی، اس نے معشوق کی زلفوں کا ذکر چھیڑ دیا، بنفشہ عین غرور اور ناز کی حالت میں شرما کر رہ گئی،

جدت میں جدت یہ ہے کہ نتیجہ یعنی بنفشہ کا شرمندہ ہو جانا بیان نہیں کیا کہ اس کے

[1] یہ شعر سعدی کا ہے،

اظہار کی ضرورت نہیں،

زاہد کی نسبت یہ خیال ظاہر کرنا مقصود تھا کہ گو وہ شراب وغیرہ استعمال نہیں کرتا تاہم چونکہ اس کی فتوحات اور نذور، ریا اور زور کے ذریعہ سے ہاتھ آتی ہیں اسلئے وہ بھی حرام سے کم نہیں، اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز باز خاست   نانِ حلال شیخ ز آبِ حرامِ ما

یعنی مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن شیخ کی حلال روٹی، میرے آبِ حرام (شراب) سے بازی نیلیجا سکے، جدت اسلوب کے ساتھ ہر لفظ ایک خاص لطف پیدا کرتا ہی،

ترسم سے دکھانا ہے کہ میں اس بات کو بطور شماتت کے نہیں کہتا، بلکہ ہمدردی کے لحاظ سے مجھ کو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو، قیامت کو باز خاست کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ کھوٹے کھرے کے پرکھنے کا دن ہے،

نان حلال، اور آب حرام کے مقابلہ نے علاوہ صنعت اضداد کے جو نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئی ہے، اصل مضمون کو نہایت بلیغ کر دیا ہے، یعنی زاہد کی روٹی باوجود حلال ہونے کے میرے آبِ حرام سے بازی نہ لیجائے، تو زاہد کے لئے کس قدر افسوس کا سبب ہوگا،

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتوی داد   کہ می حرام ولے بہ ز مالِ اوقاف است

اس طرز ادا کی بلاغت پر لحاظ کرو، اول تو اس امر کا اعتراف کہ شراب گو حرام سہی لیکن مال وقف سے بہر حال اچھی ہے، خود فقیہ کی زبان سے کرایا ہی، اس کے ساتھ مست کی قید لگا دی ہے، جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ فقیہ سچی بات کا اظہار یوں کاہے کو کرتا، مست تھا، اس لئے پس و پیش کا خیال نہ آیا، درجو دل میں تھا زبان سے کہہ گیا،

زاہد خدا کا تصور جو دلوں میں قائم کراتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ مجسم قہر و غضب ہی، ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوتا رہتا ہی، اور نہایت بے رحمانہ سزائیں دیتا ہے لیکن اہلِ نظر کے نزدیک خدا سرتا پا لطف اور رحم ہے، اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

پیر دردی کش ما گرچہ ندارد زر و زور　　خوش عطا بخش و خطا پوش خدائے دارد

خدائے" کی تنکیر نے کیا لطف پیدا کیا ہی، گویا ایسا خدا بہت غیر معروف ہی، زاہد وغیرہ سے اس سے مطلق شناسائی نہیں،

یہ مضمون کہ میں نے معشوق کا انتخاب ایسی دیدہ وری سے کیا کہ ہر شخص نے اسکی داد دی، اس کو یوں ادا کرتے ہیں،

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشم من　　کارے کہ کرد دیدۂ من بے بصر نہ کرد

یعنی جس نے تیرا چہرہ دیکھا، میری آنکھیں چوم لیں کہ کیا عمدہ انتخاب ہے، میری آنکھ نے جو کام کیا دیکھ بھال کے کیا،

شاہد بازی کی نسبت یہ عذر خواہی کہ اور لوگ بھی تو کرتے ہیں، عام مضمون ہے، سعدی فرماتے ہیں،

گر کند میل بہ خوبانِ دلِ من خردہ مگیر　　کیں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

اسی مضمون کو خواجہ صاحب جدید اور لطیف اسلوب سے ادا کرتے ہیں،

من ارچہ عاشقم و رند و مست نامہ سیاہ　　ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہ اند

شعر کا ظاہری مطلب یہ ہی کہ میں اگرچہ گنہگار اور نالائق ہوں لیکن خدا کا شکر ہے کہ شہر میں اور لوگ پاکیزہ خیال ہیں، جس کی برکت سے میری شامت اعمال کا اثر اوروں پر نہ پڑیگا، لیکن حقیقت میں یہ اوروں پر درپردہ چوٹ ہے، سعدی نے کھلے لفظوں

میں کہدیا، خواجہ صاحب کنایۃً ادا کرتے ہیں،

خدا کے عفو کے بھروسہ پر شراب پینے کی جرأت اس پیرایہ میں دلاتے ہیں،

بیار بادہ بخور زاں کہ پیر میکدہ دوش — بسے حدیث غفور و رحیم و رحمٰن گفت

اس موقع پر خدا کے متعدد نام جن سے رحم اور مغفرت کا اظہار ہوتا ہے، لانا کس قدر بلاغت ہے،

دنیا کی بے ثباتی کو اس انداز میں ادا کرتے ہیں،

سرود مجلس جمشید گفتہ اند ایں بود — کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا کچھ اعتبار نہیں، اس لئے یہ چند روزہ زندگی عیش و عشرت میں گذار دو، کل خدا جانے کیا ہوگا، اس مضمون کے لئے کس قدر بلیغ پیرایہ اختیار کیا ہی، عیش اور کامیابی میں جمشید سب سے نامآور ہے، تاہم خود اس کی مجلس میں یہ راگ گایا جاتا تھا، اس سے بڑھ کر دنیا کی بے ثباتی کا کیا ثبوت ہوگا، جمشید کا نام اس بے حقیقتی سے لیناکہ القاب و خطاب ایک طرف، پورا نام بھی نہیں، اس مضمون کو نہایت باثر کر دیتا ہی،

شرم ازاں چشم سیہ بادش و مژگانِ دراز — ہر کہ دل بردن او دید و در انکار من است

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ جو شخص میرے اوپر اعتراض کرتا ہے، اگر معشوق کو دیکھ لیتا تو اعتراض سے باز آتا، اس کو یوں ادا کیا ہے کہ جو شخص میری دل باختگی پر اعتراض کرتا ہے، اس کو معشوق کی آنکھ اور مژگاں سے شرم نہیں آتی، یعنی مجھ پر اعتراض کرنا گویا آنکھوں کی دلربائی سے انکار کرنا ہی،

یارب این نکتہ کہ در عالم — رخسارہ بہ کس ننمود آں شاہد ہرجائی

اس مضمون کو کہ شاہد مطلق (خدا) کا جلوہ اگرچہ ایک ایک ذرہ میں چمکتا ہے، لیکن اسکی

حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی، کس بدیع اسلوب سے ادا کیا ہے، یعنی کس قدر تعجب ہے کہ ہر جائی بھی ہے اور آج تک کسی نے اس کو دیکھا بھی نہیں، وصالی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

اے کہ در ہیچ جا نہ داری جا　　　بو العجب ماندہ ام کہ ہر جائی

لیکن خواجہ صاحب کی طرز ادا میں لطافت کے علاوہ اسلوب بھی زیادہ معنی خیز ہے، بدیع الاسلوبی کے اچھی طرح سے سمجھ میں آنے کے لئے ہم چند مثالیں لکھتے ہیں، جن سے ظاہر ہو گا کہ ایک مضمون جو کسی اور استاد نے باندھا تھا، خواجہ صاحب نے خوبی ادا سے اس کو کس قدر بلند رتبہ کر دیا ہے،

سعدی	حافظ
تو گرچہ امیر و ما فقیریم دل داری دوستاں ثواب است	در راہ عشق، فرق غنی و فقیر نیست ای بادشاہ حسن سخن با گدا بگو
ای بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم تو عشق گلے داری من عشق گل اندامی	بنال بلبل اگر با منت سر یاری است کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

شیخ صاحب کہتے ہیں کہ "بلبل اگر تو رونے پر آمادہ ہو تو میں بھی تیرا ساتھ دینے کو موجود ہوں، مجھ کو تجھ سے ہمدردی کی یہ وجہ ہے کہ تو گل پر عاشق ہے اور میرا معشوق بھی گل اندام ہے"، غرض شیخ نے ہمدردی کی وجہ معشوق کا یک گونہ اشتراک قرار دیا ہے، لیکن یہ پہلو نزاہت اور غیریت سے ذرہ ہٹا ہوا ہے، اس لئے خواجہ صاحب ہمدردی کی وجہ صرف عشق کی شرکت قرار دیتے ہیں، معشوق کے اشتراک سے کوئی تعلق نہیں، اس کے ساتھ خود بلبل کے پیرو نہیں بنتے، بلکہ بلبل کو اپنا پیرو بناتے ہیں "دو" کے لفظ پر جو زور

دیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے صحیح دعویدار صرف دو ہی ہو سکتے ہیں عاشق اور بلبل، ان باتوں کے ساتھ نزار اور زاری کے اجتماع اور مطلع ہونے نے شعر کو نہایت بلند پایہ کر دیا ہے،

حافظ	سعدی
چہ غدر ناز بخت خود گویم کہ آں عیار شہر آشوب	ای گنج نوشدارو درخستگان نظر کن
بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد	مرہم بدست و مارا مجروح می گذاری

خواجہ صاحب نے شیخ کے مضمون کا پیرایہ کس قدر لطیف کر دیا ہے،

حافظ	سلمان
عاشق و رند و نظر بازم و می گویم فاش	رندی و عاشقی و قلاشی
تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام	ہیچ شک نیست کہ در ماہمہ ہست

چستی بندش اور جوش بیان کے علاوہ سلمان صرف یہ کہتے ہیں کہ مجھ میں یہ سب باتیں ضرور ہیں، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان باتوں پر ان کو فخر ہے، یا ندامت، خواجہ صاحب صرف ان اوصاف کے پائے جانے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ان کو باعث ناز قرار دیتے ہیں، ع تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام،

حافظ	سلمان
گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں	مکن ملامت رندان اگر بہ بدنامی
ما نمی خواہیم ننگ و نام را	کہ ہرچہ پیش تو ننگ است نام ما است

سلمان کہتے ہیں کہ ہم کو ملامت نہ کرو کیونکہ جس چیز کو تم ننگ سمجھتے ہو وہی ہمارے نزدیک ناموری کی بات ہے، اس مضمون میں یہ نقص ہے کہ اس سے اس قدر پھر ثابت ہوتا ہے

کہ ان کو نام کی خواہش ہے، گو وہ نام آوروں کے نزدیک ننگ ہے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم کو نام وننگ سے سرے سے غرض ہی نہیں اور رندی کی یہی شان ہے،

سلمان	حافظ
شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل	شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد
شاہد آں ست کہ ایں دارد و آنے دارد	بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد
دیدہ ام طلعت زیباش کہ آنے دارد	
ایں ہمہ شیفتہ از پے آں می گردم	

اصل مضمون یہ تھا کہ معشوق پن صرف تناسب اعضا کا نام نہیں، بلکہ اصلی چیز ناز و انداز ہے، سلمان نے اس مضمون کو جس طرح ادا کیا، اُس میں ایک اور لفظی خوبی یعنی این و آن کا مقابلہ شامل کر دیا، جس سے اصل مضمون کا زور ہٹ گیا، اس لئے خواجہ صاحب نے اصل مضمون کو صنعت لفظی سے بالکل الگ کر کے بیان کیا، لیکن این و آن کا لطف بھی ہاتھ سے دینے کے قابل نہ تھا، اس لئے دوسرے موقع پر اس کو زیادہ نمایاں پیرایہ میں ادا کیا،

این کہ می گویند آں بہتر ز حسن | یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہیں، ہمکو صرف نمونہ دکھانا مقصود تھا،

ان جزئی اسالیب سے قطع نظر کر کے کلی اسالیب پر نظر ڈالو، خواجہ صاحب نے جن مضامین کو زیادہ تر باندھا ہے، وہ شراب کی تعریف، رندی و سرمستی کی ترغیب، دنیا کی بے ثباتی، واعظوں اور زاہدوں کی پردہ دری ہے، ان میں سے ہر مضمون کے ادا کرنے کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے، اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا، اور یہی وجہ ہے کہ انہی مضامین پر اور اساتذہ کے سیکڑوں ہزاروں اشعار موجود ہیں، لیکن عام محفلوں میں

خواجہ صاحب ہی کے ترانے زبانوں پر ہیں،

واردات عشق خواجہ صاحب نے شاعری کی مختلف انواع کو لیا ہے، اور ہر نوع کو اعلیٰ رتبہ پر پہنچایا ہے، لیکن ان کی اصلی شاعری عشق وعاشقی اور رندی وسرمستی ہے، رندانہ مضامین وہ جس آزادی، رنگینی اور جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اسکی تفصیل جوش بیان کے عنوان میں گذر چکی، عشقیہ مضامین سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے، لیکن یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہئے (جیسا کہ ہم ابتدا میں لکھ آئے ہیں) کہ خواجہ صاحب کے عشقیہ جذبات غم اور درد سے کم تعلق رکھتے ہیں، وہ فطرۃً شگفتہ مزاج اور رنگین طبع تھے، اس لئے عشق وعاشقی سے ان کو وہیں تک تعلق ہے، جہانتک لطف طبع اور شگفتگی خاطر کے کام آئے، وہ ناامیدی، حسرت، یاس وغیرہ پر کچھ لکھتے ہیں تو محض تقلید ہوتی ہے، وہ غمگین منہ بنانا بھی چاہتے ہیں تو چہرہ سے شگفتگی نہیں جاتی، اس بنا پر وہ شوق، نازونیاز، بوس وکنار، بزم آرائی ومجلس افروزی کے جذبات اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں، وہ اس قسم کا عشق نہیں کرتے، کہ کسی کے پیچھے زندگی برباد کر دیں گلیوں میں پڑے پھریں، ان کا عشق بھی لطف نظر ہے، اچھی صورت سامنے آئی دیکھ لی، دل تازہ ہو گیا، پاس بیٹھ گئے، ہمزبانی کا لطف اُٹھایا، زیادہ بھیلے تو سینہ سے لگا لیا، گلے میں باہیں ڈالدیں، اس حالت میں بھی کوئی برا خیال نہیں، پاکبازی اور پاک نظری کی روک قائم ہے، خود فرماتے ہیں،

منم کہ شہرۂ شہرم بہ عشق ورزیدن
منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

باایں ہمہ عشق ومحبت میں جو جو واردائیں گذرتی ہیں ایک ایک سے باخبر ہیں اور ان سب جذبات کو اسی سچائی اسی واقعیت اسی جوش کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں، جس طرح دل میں آتے ہیں اور یہی اصلی شاعری ہے، وہ کوئی بات نہیں کہتے جب تک کوئی جذبہ دل

میں نہیں پیدا ہوتا معشوق کی تعریف بھی جو شاعروں کا رات دن کا وظیفہ ہے کرنا چاہتے ہیں، تو اسی وقت کرتے ہیں جب معشوق کی کسی نئی ادا سے دلپر نئی چوٹ پڑتی ہے، ورنہ یوں کچھ کہہ جاتے ہیں تو اس کو بیکار سمجھتے ہیں، خود فرماتے ہیں،

نکتہ ناسنجیدہ گفتم دلبرا! معذور دار — عشوۂ فرماسے تا من طبع را موزوں کنم

غنی نے اسی بات کو اپنے انداز میں کہا ہے،

جلوۂ حسن تو آورد مرا بر سر فکر — تو حنا بستی و من معنی رنگیں بستم

خواجہ صاحب اس نکتہ سے خوب واقف ہیں کہ عشق محض ظاہری حسن و جمال سے نہیں پیدا ہوتا اور ہوتا ہے تو وہ عشق نہیں بلکہ ہوس پرستی ہے، عشق کیلئے معشوق میں حسن و جمال کے سوا اور بہت سی ادائیں ہونی چاہئیں، اسی نکتہ کو سلمان ساوجی نے بھی ادا کیا تھا

شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل — شاہد آن ست کہ ایں دارد و آنے دارد

لیکن سلمان نے آن کی تخصیص کردی، خواجہ صاحب بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں،

شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد — بندہ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

لیکن یہیں تک بس نہیں کرتے، بلکہ آگے بڑھتے ہیں،

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری است — کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری است

عاشق جب عشق سے لطف اٹھاتا ہے تو عام فطرت انسانی کے لحاظ سے اوروں کو بھی اس مزہ کے اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے، اس جذبہ کو عجیب لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

مصلحت دید من آن است کہ یاران ہمہ کار — بگذارند و سر زلف نگارے گیرند

شہرے پُر از حریفاں و ز ہر طرف نگارے — یاران! صلاے عشق است گر می کنید کارے

اس مستی کو دیکھو کہ "یارو کو کوئی کام کرنا ہے تو بس یہ (عشق) کرنے کا کام ہے،

عاشق کو جب وصل کا تصور آتا ہے، تو یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ معشوق کو طرح

طرح سے آراستہ کرونگا، پھولوں کے زیور پہناؤنگا، تخت پر بٹھاؤنگا اور عرض کرونگا کہ
کہ معشوقانہ انداز سے بیٹھے اور تماشائیوں پر بجلی گرائے، ان جذبات کی تصویر دیکھو،

به تخت گل بنشانم بتے چو سلطانے | ز سنبل و سمنش ساز و طوق و یارہ کنم
(چنبیلی زیور طوق کنگن)

کرشمہ کن و بازار ساحری بشکن | بہ غمزہ رونق بازار ساحری بشکن

بہ باد دہ سر و دستار عالمے یعنی | کلاہ گوشہ بہ آئینِ دلبری بشکن
(لوگوں کی پگڑیاں اچھال)

چو عطر سائی شو و زلف سنبل از دم باد | تو قیمتش بہ سر زلف عنبری بشکن

بہ زلف گوئی کہ آئینِ دلبری بگذار | بہ غمزہ گوے کہ قلب ستمگری بشکن
(فوج)

بروں خرام و ببر گوی خوبی از ہمہ کس | سزاے حور بدہ رونق پری بشکن

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ وصل میں دل کے کانٹے نکل جاتے ہیں اور تسکین ہو جاتی ہے
لیکن صاحب ذوق جانتا ہے کہ وصل میں آتش شوق اور بھڑکتی ہے، اور دل کا ولولہ
کسی طرح کم نہیں ہوتا، اسی بنا پر عرب کا شاعر کہتا ہے،

بِکُلٍ تَدَاوَیْنَا فَلَمْ یَشْفِ مَا بِنَا | عَلٰی اَنَّ قُرْبَ الدَّارِ خَیْرٌ مِنَ الْبُعْدِ

یعنی ہم سب کرکے دیکھ چکے کسی سے تسلی نہیں ہوتی تاہم ہجر سے وصل پھر اچھا ہے، خواجہ صاحب اس نکتہ کو یوں ادا کرتے ہیں،

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت | و اندراں برگ و نوا خوش نالہاے زار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست؟ | گفت ما را جلوۂ معشوق دریں کار داشت

معشوق نے چند روز بے وفائی برتی ہے، پھر صاف ہو گیا ہے، عاشق کو پچھلی باتیں
یاد آتی ہیں، لیکن قصداً بھلاتا ہے اور معشوق کو مطمئن کرتا ہے کہ مجھکو کوئی شکایت نہیں،
اتفاقیہ باتیں تھیں، ہو گئیں، اس حالت کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

گر ز دست زلف مشکینت خطاے رفت رفت | ور ز ہندوی شما بر من جفاے رفت رفت

اس بلاغت کو دیکھو کہ ظلم و ستم کو معشوق کی طرف منسوب نہیں کرتا، بلکہ زلف کا نام لیتا ہے اور اس کو ہندو (چور ظالم) کہتا ہے کہ اس سے یہ کیا بعید ہے،

برق عشق ار خرمن پشمینہ پوشی سوخت سوخت ۔ جور شاہ کامراں گر بر گدائی رفت رفت

گر دلم از غمزۂ دلدار تابے برد برد ۔ درمیان جان و جانان ماجرائی رفت رفت

کبھی عاشق کے دل میں یہ جذبہ اٹھتا ہے کہ معشوق کو اور لوگ بھی چاہتے ہونگے لیکن میری سی جانبازی کون کرسکتا ہے اس خیال کو محبت کے انداز سے معشوق کے سامنے بھی ظاہر کردیتا ہے،

خواجہ صاحب اس جذبہ کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں،

شبے مجنوں بہ لیلی گفت کای معشوق بے ہمتا ۔ ترا عاشق شود پیدا و لے مجنوں نخواہد شد

اس موقع پر مجنوں کے لفظ نے کیا بلاغت پیدا کی ہے، یہ مضمون سیکڑوں نے باندھا ہے، لیکن یہ پیرایہ کسی کو نصیب نہ ہوا،

بعض وقت جب معشوق کا ناز اور تمکنت حد سے گذر جاتی ہے، تو عاشق تنگ آکر کہدیتا ہے، کہ اتنا بھی حد سے نہ گذرے، دنیا میں اور ہزاروں صاحب جمال ہیں، معشوق بھی جانتا ہے کہ بات سچ ہے، لیکن سمجھتا ہے کہ عاشق کے منصب کے خلاف ہے، ان سچے جذبات کو خواجہ صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں،

صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت ۔ ناز کم کن کہ دریں باغ بسی چوں تو شگفت

گل بخندید کہ از راست نہ رنجیم و لے ۔ ہیچ عاشق سخنے سخت بہ معشوق نہ گفت

عشق کے جذبات اگرچہ عالم شباب کے لئے خاص ہیں، لیکن بڑھاپے میں بھی یہ آگ سرد نہیں ہوتی، عاشق پر اس زمانہ میں مختلف حالات گذرتے ہیں کبھی کہتا ہے،

ع رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولی

کبھی خیال کرتا ہے کہ عشق کی گرمی خود جوان بنا دے گی، اس حالت میں کبھی معشوق سے کہتا ہے،

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر　　　که سحر گه ز کنار تو جوان برخیزم

کبھی کہتا ہے،

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم　　　ہر گہ کہ یاد روی تو کردم جواں شدم

اسی بنا پر رکنائے کاشی نے کہا ہے، ع عشق در ایام پیری چوں بہ سرما آتش است، ان خیالات کے ساتھ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ حالت عبرت انگیز ہے، اس حالت میں خود اپنی حالت پر افسوس کرتا ہے، اور عبرت کے لہجہ میں کہتا ہے،

دیدی دلا کہ آخر پیری و زہد و علم　　　با من چہ کرد دیدۂ معشوقہ باز من

یہ سب اصلی واردات ہیں، جو عاشق کو پیش آتی ہیں، خواجہ صاحب نے انکو بے کم و کاست ادا کیا ہے،

معشوق جب صاحب جاہ اور عاشق مفلس اور کم مایہ ہوتا ہے تو معشوق کو عاشق کی طرف التفات سے عار ہوتی ہے لیکن عاشق میں یہ امتیاز ملحوظ نہیں، اس بنا پر قاصد سے خطاب کرکے کہتا ہے،

گر دیگرت بداں در دولت گذر بود　　　بعد از ادای خدمت و عرض دعا بگو

در راہ عشق فرق غنی و فقیر نیست　　　اے بادشاہ حسن سخن با گدا بگو

غرض اس طرح کے سیکڑوں جذبات ہیں جن کو خواجہ صاحب نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اور جس کی مثال، اساتذہ کے کلام میں نہیں مل سکتی، ہم سرسری طور پر یکجائی چند اشعار نقل کرتے ہیں،

معشوق کی نسبت بدگمانی،

خواب آں نرگسِ فتّان تو بے چیزے نیست　　تابِ آں زلف پریشانِ تو بے چیزے نیست

ظلم کے بعد معشوق کے رحم کی داد،

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب　　کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

رقیب سے چھپ کر سرگوشی،

خدارا اے رقیب امشب زمانے دیدہ برہم نہ　　کہ من با لعل جاں بخشش نہانی یک سخن دارم

معشوق کی عام آمیزی کی شکایت،

زلف در دست صبا گوش بہ پیغام رقیب　　ایں ہمہ با ہمہ درساختۂ یعنی چہ

عشق سے پارسائی میں فرق آنے کا خطرہ،

می ترسم از خرابی ایماں کہ می برد　　محراب ابروی تو حضورِ نماز من

معشوق نے چارہ ساز ہو کر چارہ نوازی نہ کی،

چہ عذر از بخت خود گویم کہ آں عیار شہر آشوب　　بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد

با کہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں سنگیں دل　　کشت ما را و دمِ عیسیِ مریم با اوست

بوسے کے ساتھ گالی کا مزہ،

قند آمیختہ با گل نہ علاج دلِ ماست　　بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

باوفا معشوق کی نظیر پیش کر کے معشوق سے التفات کی خواہش،

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند　　ای دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

حیا اور رونے کی وجہ سے افشائے راز،

ترا حیا و مرا آب دیدہ شد غماز　　وگرنہ عاشق و معشوق راز دارانند

اوروں کی کامیابی پر حسرت

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی　　　　بہ یاد آر حریفانِ بادہ پیما را

داستانِ عشق کی دلچسپی،

یک قصہ بیش نیست غمِ عشق این عجب　　　　از ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است

معشوق پر فدا ہونے کا انتظار اور اس کا اعراض،

می خواستم کہ میرمش اندر قدم چو شمع　　　　او خود گذر بہ من چو نسیمِ سحر نہ کرد

معشوق کی یاد میں شب گذاری کا لطف،

از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دمِ صبح　　　　بوی زلفِ تو ہماں مونسِ جان است کہ بود

معشوق نہ زر سے ہات آتا اور نہ خود ملتفت ہوتا،

از بہر بوسۂ زلبش جاں ہمی دہم　　　　اینم نمی ستانم و آنم نمی دہد

اہلِ تقویٰ برا مانیں تو مانیں، شاہد پرستی نہیں چھوڑی جا سکتی،

شراب لعل کش و روی مہ جبیناں بین　　　　خلافِ مذہب آناں جمالِ اینان بین

فلسفہ | خواجہ صاحب کا فلسفہ قریباً وہی ہے جو خیام کا ہے، خواجہ صاحب نے انہی مسائل کو زیادہ تفصیل، زیادہ توضیح اور زیادہ جوش کے ساتھ ادا کیا ہے، چنانچہ ہم ان کو بدفعات بیان کرتے ہیں،

(۱) ان کا فلسفہ اس مسئلہ سے شروع ہوتا ہے، کہ انسان کو کائنات کے اسرار اور ان کی حقیقت کچھ معلوم نہیں، اور نہ معلوم ہو سکتی! اس مضمون کو سقراط، فارابی، ابن سینا، خیام سب نے بیان کیا تھا، لیکن خواجہ صاحب جس بلند آہنگی، اور جوش و ادعا کے ساتھ کہتے ہیں، وہ ان کا خاص حصہ ہے،

بروای زاہد خود بیں! کہ ز چشم من و تو — راز این پردہ نہان است و نہان خواہد بود

انداز بیان کی بلاغت کو دیکھو! کلام کی ابتدا ایسے لفظ سے کی ہے، جس سے زاہد کی دعوی راز دانی کی سخت تحقیر ظاہر ہوتی ہے، خود بیں کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ دعوی صرف خود بینی کی بنا پر ہوتا ہے، زاہد کے ساتھ اپنے آپ کو بھی شریک کر لیا ہے، جس سے زاہد کی خاطر داری اور دعوی کی تعمیم مقصود ہے یعنی اس امر میں عارف و زاہد، عالم و جاہل سب برابر ہیں، دوسرے مصرع میں ماضی کے ساتھ آئندہ زمانہ کو بھی داخل کر لینے سے دعوی میں زیادہ زور اور تعمیم پیدا ہو گئی ہے،

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں — کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

حدیث از مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

دانا چو دید بازی این چرخ حقہ باز — ہنگامہ باز چید و در گفتگو بہ بست

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا است — این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

ساقیا جام میم دہ کہ نگارندۂ غیب — نیست معلوم کہ در پردۂ اسرار چہ کرد

آں کہ پر نقش زد این دائرۂ مینائی — کس ندانست کہ در گردش پرگار چہ کرد

نشوی واقف یک نکتہ ز اسرار وجود — گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ دوراں را

در کارخانۂ کہ رہ عقل و علم نیست — وہم ضعیف رائے فضولی چرا کند

ما از بروں در شدہ مغرور صد فریب — تا خود درون پردہ چہ تدبیر می کنند

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

راز درون پردہ چہ داند فلک خموش — اے مدعی نزاع تو با پردہ دار چیست

با ہیچ کس نشانے زاں دلستاں ندیدم — یا من خبر ندارم یا او نشاں ندارد

مردم در انتظار دریں پردہ راہ نیست یا ہست و پردہ دار نشانم نمی دہد

(۲) شاہد مطلق کا ظہور اگرچہ ہر جگہ ہے اور ذرہ ذرہ میں اسکی چمک موجود ہی لیکن کوئی شخص اس کو پہچان نہیں سکتا،

(۳) اسرار کائنات اگرچہ حقیقت میں معلوم نہیں ہو سکتے لیکن جو کچھ بھی معلوم ہو سکتا ہے، وہ علوم درسیہ کی تحصیل اور بحث ومباحثہ سے نہیں معلوم ہو سکتا، بلکہ مجاہدہ، ریاضت، وجدان اور کشف سے معلوم ہو سکتا ہی، خواجہ صاحب نے ارباب ذوق اور مشاہدہ کا نام ساقی، بادہ فروش، رند رکھا ہے، اور اسی بنار پر ہر جگہ پیر مغاں اور بادہ فروش کی حلقہ بگوشی کا دعوی کرتے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں زہاد یعنی علمائے ظاہری کو بے حقیقت سمجھتے ہیں،

راز درونِ پردہ زرندان مست پرس کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

سِرِّ خدا کہ عارف وسالک بہ کس نہ گفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

اے کہ از دفتر عقل آیت عشق آموزی ترسم ایں نکتہ بہ تحقیق ندانی دانست

سر زحیرت بہ درمیکدہا برکردم چوں شناسائی تو در صومعہ یک پیر نبود

حلاج بر سر دار ایں نکتہ خوش سراید از شافعی مپرسید امثال ایں مسائل

مرزا غالب نے اس خیال کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے،

آں راز کہ درسینہ نہان است نہ وعظ است بر دار تواں گفت وبہ منبر نتواں گفت

(۴) صوفیہ کے نزدیک علم حاصل ہونے کا ذریعہ بیرونی چیزوں کا مطالعہ نہیں ہے ان کے نزدیک دل پر جب ایک خاص طریقہ سے توجہ، اور مدت تک اس پر مواظبت

کی جاتی ہے، تو دل خود ادراکات اور معلومات کا سرچشمہ بن جاتا ہے، جس طرح انبیاؑ کا علم باہر سے نہیں آتا، بلکہ فوارہ کی طرح اندر سے اچھلتا ہے، خواجہ صاحب نے اس مسئلہ کو نہایت پرجوش اور بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے،

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست
واندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم
گفت آں روز کہ ایں گنبدِ مینا می کرد

یعنی میں نے ساقی (عارف) کو دیکھا کہ خوشی سے کھلا جاتا ہے، ہات میں شراب کا پیالہ ہے، اس کو بار بار دیکھتا ہے، اور اس میں اس کو گوناگوں عالم نظر آتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کارپردازِ فطرت نے تم کو یہ جام جہاں بیں کس دن عنایت کیا تھا، بولا کہ جس دن یہ سبز گنبد (آسمان) تعمیر کر رہا تھا،

(۶) خواجہ صاحب کا میلان زیادہ تر جبر کی طرف معلوم ہوتا ہے، یعنی انسان خود مختار نہیں ہے کوئی اور قوت ہے جو اس سے کام لے رہی ہے، اگرچہ بعض جگہ اس کے خلاف بھی ان کے قلم سے نکل جاتا ہے، مثلاً ع

ہر عمل اجرے و ہر کار جزائے دارد

لیکن ان کا اصلی رجحان طبع جبر ہی کی طرف ہے، یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر خلافِ عقل ہے، لیکن فلسفہ کی انتہائی منزل یہی ہے، اور ارباب فنا بھی اسی نشہ میں چور ہیں، خواجہ صاحب اس عالم میں آتے ہیں تو ان کی سرمستی حد سے بڑھ جاتی ہے اور عجیب جوش و خروش کا عالم ہوتا ہے،

نقشِ مستوری و ہستی نہ بہ دستِ من و تست
آنچہ استادِ ازل گفت، بکن آں کردم

بارہا گفتہ ام و بار دگر مے گویم
کہ من دل شدہ ایں رہ نہ بخود می پویم

بروای ناصح و بر دردکشاں خردہ مگیر　　کارفرمای قدر می کند این من چہ کنم

برقِ غیرت کہ چنیں می جہد از پردۂ غیب　　تو بفرما کہ منِ سوختہ خرمن چہ کنم

مرا مِہرِ نکو رویاں ز سر بیروں نخواہد شد　　قضائے آسمان است و دیگر گوں نخواہد شد

مرا روزِ ازل کارے بجز رندی نفرمودند　　ہر آں قسمت کہ آں جا شد کم و افزوں نخواہد شد

مستور و مست ہر دو چو از یک قبیلہ اند　　ما دل بہ عشوہ کہ دہیم، اختیار چیست؟

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　انچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

(۵) کمال اور ترقی کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں یہ غلط ہے کہ ع

حریفان بادہا خوردند و رفتند

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید　　دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد

(۶) بندگانِ خاص کی فطرت ہی جدا ہوتی ہے، وہ بات ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی

گوہرِ جامِ جم از طینتِ خاکِ دگر است　　تو توقع ز گلِ کوزہ گراں میداری

فلسفہ اخلاق | خواجہ صاحب کی اخلاقی تعلیم، اعلیٰ درجہ کے فلسفہ انسانیت کی تصویر ہے

ان کا طرزِ عمل خود ان کی زبان سے یہ ہے،

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن　　کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ع　فرضِ ایزد بگذاریم و بکس بد نہ کنیم

ما نہ گوئیم بد و میل بہ ناحق نہ کنیم　　جامۂ کس سیہ و دلق خود ازرق نہ کنیم

نہ صرف اچھوں بلکہ بروں کو بھی ہم برا کہنا پسند نہیں کرتے کیونکہ گو برے کو برا کہنا چنداں مضائقہ نہیں پھر بھی برائی سے خالی نہیں، اس لئے سرے سے اس کام کو چھوڑ دینا بہتر ہے

عیب درویش و توانگر بہ کم و بیش بد است　　کارِ بد مصلحت آن است کہ مطلق نکنیم

ہم اپنے نکتہ چینوں اور مخالفوں سے بھی ناراض نہیں ہوتے اس لئے کہ اگر وہ حق کہتے ہیں تو حق کے برا ماننے کی کوئی وجہ نہیں، اور اگر غلط کہتے ہیں تو غلط بات کا کیا رنج،

حافظ از خصم خطا گفت نگیریم بر او ۔۔۔ ور کہ حق گفت جدل با سخنِ حق نہ کنیم

ہماری مجلس عام ہے کسی کی تخصیص نہیں، جو چاہے آئے، ہم سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں، واعظوں اور زاہدوں کی طرح ہمارا اخلاق دوست دشمن، عزیز و بیگانہ، کافر و مسلمان کی تفریق کی وجہ سے بدلا نہیں کرتا،

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو ۔۔۔ گیر و دار حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است ۔۔۔ ورنہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

ہم کو صرف مہر و محبت سے کام ہے، دشمنی، بغض اور کینہ ہمارا طرز عمل نہیں،

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم ۔۔۔ از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

قفا خوریم و ملامت کشیم و خوش باشیم ۔۔۔ کہ در طریقتِ ما کافری است رنجیدن

بہ پیر میکدہ گفتم کہ چیست راہ نجات ۔۔۔ بخواست جام می و گفت عیب پوشیدن

فرائض اور عبادات بہشت کے لالچ سے نہیں کرنی چاہئیں، بلکہ اس لئے کرنی چاہئیں کہ فرض انسانی ہیں، بہشت بے شک معاوضہ میں ملے گی، لیکن تمہارا مطمحِ نظر یہ نہیں ہونا چاہیے،

تو بندگی چو گدایان بہ شرط مزد مکن ۔۔۔ کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

من آں نگین سلیماں بہ ہیچ نستانم ۔۔۔ کہ گاہ گاہ برو دست اہرمن باشد

مشہور ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کی تاثیر سے تمام جن اور انسان ان کے تابع تھے، ایک دفعہ ایک شیطان نے اس کو کسی طرح اڑا لیا، حضرت

سلیمانؑ کی سلطنت اور شان و شوکت سب جاتی رہی، یہاں تک کہ مچھلیاں بیچ کر زندگی بسر کرتے تھے، خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ جس انگوٹھی پر کبھی کبھی شیطان کا قبضہ ہو جاتا ہے میں اس کو کوڑی کے مول بھی نہیں خریدتا،

گرچہ گرد آلود فقرم شرم باد از ہمتم | گر بہ آب چشمۂ خورشید دامن تر کنم

بہ خرمن دو جہاں سر فرو نمی آرند | دماغ کبر گدایانِ خوشہ چیناں بین

ما ملکِ عافیت نہ بہ لشکر گرفتہ ایم | ما تختِ سلطنت نہ بہ بازو کشادہ ایم

لیاقت جب تک نہ ہو بڑوں کی برابری نہیں کرنا چاہیے،

تکیہ بر جاے بزرگاں نتواں زد بگزاف | مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

ذاتی لیاقت درکار ہے، خاندانی شرف کافی نہیں،

تاج شاہی طلبی گوہر ذاتی بنما | ور خود از گوہر جمشید و فریدوں باشی

تحصیل مقصد کے لئے کوشش درکار ہے،

در رہِ منزلِ لیلےٰ کہ خطرہاست بجاں | شرطِ اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

ترغیب عمل،

اے دل بہ کوی عشق گذارے نمی کنی | اسباب جمع داری و کارے نمی کنی

چوگاں بدست داری و گوی نمی زنی | بازے چنیں بدست و شکارے نمی کنی

علما اور واعظین کی پردہ دری | اخلاقی تعلیم اس بات پر موقوف ہے کہ شاعر فطرت انسانی کا نکتہ شناس ہو، جو عیب اور برائیاں کھلی کھلی ہوتی ہیں، ان کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے لیکن مخفی اور سربستہ عیوب تک ہر شخص کی نگاہ نہیں پہونچ سکتی، اس لئے جو شاعر فلسفہ اخلاق کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اس کے لئے فطرت کا نکتہ شناس ہونا سب سے پہلی شرط ہے،

ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ لطیف اور دل آویز طریقوں سے یہ عیوب ظاہر کئے جائیں تا کہ لوگوں کو گراں نہ گذریں بلکہ خود ان کو ان کے سننے میں لطف آئے، مخفی اور دقیق عیوب جس قدر علماء، واعظین اور زہاد میں پائے جاتے ہیں کسی فرقہ میں نہیں پائے جاتے، چنانچہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے، لیکن چونکہ یہ فرقہ ہمیشہ با اقتدار رہا ہے، اس لئے ان کے عیوب کا ظاہر کرنا آسان بات نہیں، امام غزالی نے اس کا جو نتیجہ اٹھایا، یہ تھا کہ ان کی جان تک معرض خطر میں آگئی، اس لئے کسی کو ہمت نہ ہوئی شعراء میں سب سے پہلے خیام نے یہ جرأت کی، اس کے بعد شیخ سعدی نے دبی زبان سے کچھ کچھ کہا، مثلاً

محتسب در قفائے رندان است　　غافل از صوفیان شاہد باز

بروں نمی رود از خانقہ یکے ہشیار　　کہ تا بہ شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند

گر کند میل بہ خوبان دلِ من خردہ مگیر　　کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

لیکن جس دلیری، آزادی اور بے باکی سے خواجہ صاحب نے اس فرض کو ادا کیا آج تک کسی سے نہ ہو سکا،

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

مشکلے دارم ز دانشمند محفل باز پرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

گوئیا باور نمی دارند روز داوری　　کیں ہمہ قلب و دغا در کار داور می کنند
(قیامت)　　(کھوٹ)　　(خدا)

دی دو میتم چہ خوش آمد کہ سحر گہ میگفت　　بر در میکدۂ با دف و نے ترسائے

گر مسلمانی ازیں است کہ حافظ دارد　　وای اگر در پس امروز بود فردائے

یعنی کل شراب خانہ کے دروازہ پر ایک عیسائی دف بجا کر یہ گاتا تھا کہ اگر اسلام اسی کا

نام ہے جو حافظ میں پایا جاتا ہے تو آج کے بعد اگر کل قیامت کا دن بھی آنے والا ہے تو ہے

اس شعر کا پیرایۂ بیان بھی کس قدر بلیغ ہے، اول تو جو کہنا ہے اس کو ایک عیسائی کی زبان سے کہا ہے، جس سے علاوہ احتیاط کے مقصود یہ ہے کہ غیروں کو بھی ان بداعمالیوں پر افسوس اور رحم آتا ہے، گانے اور بجانے کے شامل کرنے سے یہ غرض ہے کہ اس ذریعہ سے لوگ زیادہ جی لگا کر سنتے تھے اور زیادہ تشہیر ہوتی تھی، اپنا نام لینے سے علاوہ احتیاط کے یہ مقصد ہے کہ دوسروں کا عیب کہتے تو ان کو توجہ نہ ہوتی،

سب سے بڑا عیب مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری کا ہوتا ہے، اس لئے نہایت دلیری سے ان کی برائیاں بیان کی ہیں،

گرچہ بر واعظ شہر این سخن آسان نشود | تاریا ورزد و سالوس، مسلمان نشود

یعنی گو واعظ کو یہ بات گراں گذرے گی، لیکن ہے یہ کہ جب تک وہ ریاکرتا رہے گا مسلمان نہیں ہوسکتا،

غلام ہمت دردی کشان یک رنگم | نہ آں گروہ کہ ازرق لباس دل سیہ اند

باده نوشے کہ درو ہیچ ریاے نبود | بہتر از زہد فروشے کہ درو روی و ریاست

من از پیر مغاں دیدم کرامت ہاے مردانہ | کہ این دلق ریائی را بہ جاے درنمی گیرد

می خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب | بہتر ز طاعتے کہ بہ روی و ریا کنند

ترسم کہ صرفۂ نہ برد روز باز خاست | نان حلال شیخ ز آب حرام ما

بیا بمی کدہ و چہرہ ارغوانی کن | مرو بہ صومعہ کاں جاسیاہ کارانند

نقد ہارا بود آیا کہ عیارے گیرند | تا ہمہ صومعہ داران پے کارے گیرند

یعنی اگر سکے پرکھے جاتے تو سب خانقاہ نشین اپنا اپنا راستہ لیتے،

مولویوں اور واعظوں کو اس میں بڑا کمال ہوتا ہے کہ تقدس کے پردہ میں اس طرح برائیاں کرتے ہیں کہ کسی کو اُن کی نسبت گمان بھی نہیں ہو سکتا، خواجہ صاحب نے اس نکتہ کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

اے دل طریق مستی از محتسب بیاموز　　　مست است و در حقِ او کس این گمان ندارد

خرقہ پوشاں ہمگی مست گذشتند و گذشت[۱]　　　قصۂ ما است کہ در کوچہ و بازار بماند

صوفیان وا ستند از گرو می ہمہ رخت　　　دلق ما بود کہ در خانۂ خمار بماند

یعنی صوفیوں نے اپنا خرقہ شراب کے عوض میں رہن بھی کیا اور واپس بھی لے لیا کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی، ہم رند، یوں رسوا ہوئے کہ ہمارا خرقہ رہن پڑا رہ گیا،

داشتم دلقے و صد عیب مرا می پوشید　　　خرقہ رہنِ مے و مطرب شد و زنار بماند

عیب چھپانے کی ایک بڑی گہری چال یہ ہے کہ کوئی اور شخص اگر وہ عیب کرتا ہوا نظر آئے تو نہایت سختی سے اس پر دارو گیر کی جائے، اس راز کو خواجہ صاحب اس طرح فاش کرتے ہیں

بادہ با محتسب شہر نہ نوشی زنہار　　　کہ خورد بادۂ تو و سنگ بہ جام اندازد

یعنی محتسب کے ساتھ کبھی شراب نہ پینا، وہ تمھارے ساتھ شراب بھی پیے گا اور تمھارا پیالہ بھی توڑ ڈالے گا،

مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری علانیہ نظر آتی ہی، اور مذہبی گروہ بھی اس کے اثر سے خالی نہیں ہوتے، اس بنا پر خواجہ صاحب فرماتے ہیں،

می خور کہ شیخ و حافظ و قاضی و محتسب　　　چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

صوفیان جملہ حریف اند و نظرباز ولے　　　زاں ہمہ حافظ سودا زدہ بدنام افتاد

---

[۱] یعنی گئی گذری بات ہوئی،

علما کے اوصاف اور اخلاق پر خوب غور کرو، تو نظر آئیگا کہ عوام کی عقیدتمندی اور نیازمندی کی وجہ سے ان میں نہایت عجب اور غرور پیدا ہو جاتا ہے، اور اس وصف کو اس لئے ترقی ہوتی جاتی ہے کہ ان کو یہ باتیں مذہبی پیرایہ میں نظر آتی ہیں، وہ کسی کو بجا کہتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ امر بالمعروف کی تعمیل ہے، سلاطین اور حکام کی درباداری کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ احکام شرعی کے اجرار کے لئے اس کی ضرورت ہے، کسی سے ذاتی عناد کی وجہ سے دشمنی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ بغض للہ ہے، غرور اور فخر کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ عزت نفس ہے، اس بنا پر یہ تمام عیوب اُن میں راسخ ہوتے جاتے ہیں، خواجہ صاحب ان تمام عیبوں کی نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں پردہ دری کرتے ہیں،

شکر ایزد کہ نہ در پردہ پندار بماند ۔۔۔ اگر از پردہ بروں شد دلِ من عیب مکن

بازار خود فروشی، ازاں راہ دیگر است ۔۔۔ در راہ ما شکستہ دلی می خرند و بس

یعنی ہمارے بازار میں صرف خاکساری کی قیمت ہے، باقی خود پرستی تو اس کا راستہ دوسری طرف سے نکلا ہے،

من ہم از مہر نگارے بگزینم چہ شود ۔۔۔ زاہد شہر چو مہر ملک و شحنہ گزید

یعنی جب زاہد نے بادشاہ پرستی اختیار کی، تو ہم بھی اگر کسی خوشرو سے دل لگائیں تو کیا ہرج ہے، یعنی بادشاہ پرستی سے شاہد پرستی بہتر ہے،

اخفائے

نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند ۔۔۔ عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

علما کی عام حالت یہ ہے کہ امر حق کو عوام کی خاطر سے کبھی ظاہر نہیں کرتے بلکہ اگر اس میں کوئی برائی کا پہلو ہے تو صرف اسی پر زور دیتے ہیں، آج کل مغربی تعلیم قوم کے لئے کس قدر ضروری اور گویا شرط زندگی ہے، لیکن صرف اس وجہ سے کہ عوام اس سے وحشت

کرتے ہیں کبھی کوئی عالم اس کی ترغیب نہیں دے سکتا بلکہ ہمیشہ اس کی مخالفت کیجاتی ہے
خواجہ صاحب نے نہایت موثر طریقے سے اس عیب پر ملامت کی ہے، وہ کہتے ہیں
کہ عوام کی خاطر سے حکمت اور حقیقت سے انکار نہ کرو، شراب میں فائدہ بھی ہے اور نقصان
بھی، اور نقصان فائدہ سے زیادہ ہے، تاہم خدا نے قرآن مجید میں فرمایا فیھما اثم
کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما یعنی قمار اور شراب میں فائدے بھی
ہیں اور نقصان بھی، لیکن نقصان زیادہ ہے، جب خدا نے باوجود اس کے کہ شراب نہایت
بری چیز ہے، اس کے فائدوں کو چھپانا نہیں چاہا، البتہ یہ بتادیا کہ فائدہ سے نقصان زیادہ
ہے، اور اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے تو امر حق کو عوام کی خاطر سے چھپانا کیونکر جائز
ہو سکتا ہے،

خواجہ صاحب نے اس بات کو جابجا نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں ادا کیا
ہے کہ مولویوں اور واعظوں کی نیکیاں بھی چونکہ ذاتی غرض پر مبنی ہوتی ہیں، اس لئے درگاہ
الٰہی میں مقبول ہونے کے قابل نہیں،

در میخانہ بہ بستند خدایا مپسند | کہ در خانۂ تزویر و ریا بگشایند

ترسم کہ صرفۂ نبرد روز بازخواست | نان حلال شیخ ز آب حرام ما

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولی | ویں دفتر بے معنی، غرق مے ناب اولیٰ

روزمرہ و محاورہ | خواجہ صاحب کی فصاحت کلام کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے
ہاں کلام میں روزمرہ اور محاورے نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو الفاظ اور
ترکیبیں رات دن استعمال میں آتے رہتے ہیں اور جن سے روزمرہ پیدا ہوتا ہے، عموماً
وہی ہوتے ہیں جو فصیح، سلیس، نرم اور رواں ہوں، اور اگر ان میں کسی قدر کمی ہوتی ہے

تو وہ روزمرہ کے استعمال سے نکل جاتی ہے، کیونکہ رات دن سنتے سنتے وہ الفاظ کانوں کو مانوس ہو جاتے ہیں، محاورات کا بھی یہی حال ہے، محاورہ اس وقت بنتا ہے جب ایک گروہ کا گروہ کسی جملہ کو کسی خاص معنی میں استعمال کرتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہ جملہ خود فصیح، سلیس، اور رواں ہو، ورنہ تحاورِ عام میں نہیں آسکتا،

ایک اور پہلو سے اس خصوصیت پر نظر ڈالو، فارسی زبان میں مفرد الفاظ بہ نسبت اور زبانوں کے نہایت کم ہیں، اس کمی کی تلافی زبان نے محاورات اور مصطلحات سے کی، شاعری کے لئے زبان پر قدرت تام حاصل ہونا سب سے ضروری شرط ہے، خواجہ صاحب کی قادر الکلامی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے جس قدر محاورات اور مصطلحات برتے، فارسی شعرا میں سے غالباً کسی نے نہیں برتے اور یہ ان کی قادر الکلامی کی ایک بڑی دلیل ہے،

خواجہ صاحب کا تمام کلام اگرچہ روزمرّہ محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے لیکن مثال کے طور پر ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں،[۱]

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز بازِ خاست | نانِ حلالِ شیخ ز آبِ حرام ما
(بازِ خاست: قیامت؛ آبِ حرام: شراب)

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا | بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں | کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

---

[۱] جو محاورات ان اشعار میں آئے ہیں ان کے معنی ہم یکجائی لکھ دیتے ہیں،

[۱] صرفہ بردن بازی لیجانا، [۲] دام باز چیدن، جال کو سمیٹ لینا، [۳] باد بدست بودن، کچھ ہاتھ نہ آنا، [۴] خدمت، سلام، [۵] در سرِ کار چیزے کردن، صرف کر دینا یا لگا دینا، [۶] ترا چہ افتادہ است، تمکو کیا پڑی ہے، [۷] ہمت توجہ اور ہمدردی، [۸] بے اندام، بے ڈول، [۹] از آں راہ دیگر ست یعنی اس کا اور راستہ ہے،

ای صبا گر بجوانانِ چمن باز رسی — خدمت از ما برسان سرو و گل و ریحان را

ترسم آن قوم که بر دردکشان می‌خندند — در سرِ کار خرابات کنند ایمان را

برو به کار خود ای واعظ این چه فریاد است — مرا فتاده دل از کف ترا چه افتاده است

روی خوب است و کمال و هنر و دامن پاک — لاجرم همتِ مردانِ دو عالم با او ست

هر چه هست از قامت ناساز بے اندام ماست — ورنه تشریف تو بر بالای کس کوتاه نیست

بندۂ پیر خراباتم که لطفش دائم است — ورنه لطفِ شیخ و زاهد گاه هست و گاه نیست

دانا چو دید بازیِ این چرخ حقه باز — هنگامه باز چید و در گفتگو ببست

در راه ما شکسته دلی می‌خرند و بس — بازار خود فروشی از آن راه دیگر است

اگرچه باده فرح بخش و باد گلبیز است — به بانگ چنگ مخور می که محتسب تیز[۱] است

می‌خواست گل که دم[۲] زند از رنگ و بوی دوست — از غیرت صبا نفسش[۳] در دهان گرفت

آسوده بر کنار چو پرگار می‌شدم — دوران چو نقطه عاقبتم در میان[۴] گرفت

فرصت نگر که فتنه در عالم اوفتاد — عارف به جام مے زد[۵] و از غم کران گرفت

حافظ چو آب لطف ز نظم تو می‌چکید — غیرے چگونه نکته[۶] تواند بر آن گرفت

مستم کن آن چنان که ندانم ز بیخودی — در عرصۂ خیال که آمد کدام رفت

در حقِ من لبت آن لطف که می‌فرماید — سخت خوب است ولیکن قدرے بهتر ازین

همای همتم عمرے ست کز جهان — هوا[۷] گرفت آن قد و بالا گرفت است

دلم جز مهر مه‌رویان طریقے برنمی‌گیرد — ز هر در می‌دهم پندش ولیکن در[۸] نمی‌گیرد

---

[۱] تیز، جھلا اور غصہ ور۔ [۲] دم زدن، دعوی کرنا۔ [۳] نفس در دہاں گرفتن، دم گھٹنا۔ [۴] درمیاں گرفتن گھیر لینا۔ [۵] زدن کسی چیز پر ٹوٹ کر گرنا۔ [۶] نکتہ گرفتن، اعتراض کرنا۔ [۷] ہوا گرفتن، ہوا میں اڑنا۔ [۸] در گرفتن اثر کرنا یا لگ جانا؛

رخ و چشمے بہ ایں خوبی تو گوئی دل ازو برگیر — بروکیں وعظ بے معنی مرا در سر نمی گیرد

میان گریہ می خندم کہ چوں شمع اندریں مجلس — زبان آتشینم ہست لیکن در نمی گیرد

بدیں شعر تر و شیریں ز شاہنشہ عجب دارم — کہ سر تا پای حافظ را چرا در زر نمی گیرد

یا وفا یا خبر وصل تو یا مرگ رقیب — بازی چرخ ازیں یکدو سہ کاری بکند

نقد ہا را بود آیا کہ عیارے گیرند — تا ہمہ صومعہ داران پے کاری گیرند

خرقہ پوشان ہمگی مست گذشتند و گذشت — قصہ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

مطرب عشق عجب ساز و نوائے دارد — نقش ہر پردہ کہ زد راہ بجای دارد (جوراگ چھیڑتا)

از راہ نظر مرغ دلم گشت ہوا گیر — اے دیدہ نظر کن کہ بہ دام کہ درافتاد

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات — با دُردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

چہ مستی است ندانم کہ رو بہ ما آورد — کہ بود ساقی؟ و ایں بادہ از کجا آورد

رسیدن گل و نسریں بہ خیر و خوبی باد — بنفشہ شاد و خوش آمد سمن صفا آورد

از دیدہ خون دل ہمہ بر روے ما رود — بر روے ما ز دیدہ ندانم چہا رود

من و انکار شراب! ایں چہ حکایت باشد — غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد

آں شد اے خواجہ کہ در صومعہ بازم بینی — کار ما با رخ ساقی و لبِ جام اُفتاد

رطل گرانم دہ اے مرید خرابات — شادی شیخی کہ خانقاہ ندارد

در زر گرفتن، سونے میں تلوا دینا، پے کاری گرفتن، کسی کام کے پیچھے پڑنا لیکن ایسے موقعوں پر اپنا راستہ لینا، کے معنی میں آتا ہے، گذشت، گئی گذری بات ہوئی، راہ بجای دارد، اصول اور قاعدہ کے موافق ہے، درافتادن، الجھنا، صفا آوردن، خیر مقدم کے وقت کہتے ہیں، چہا رود، کیسے گذرے گی، شادی شیخی یعنی ان کے آنر میں، بہ فلاں بخشیدن، ان کے صدقہ میں،

شراب وعیش نہاں چیست کار بے بنیاد | زدیم بر صفِ رنداں، و ہرچہ بادا باد
یارب بوقتِ گل گنہ بندہ عفو کن | ویں ماجرا بسرو لب جو بہار بخش
حاشا کہ من بہ موسم گل ترک می کنم | من لاف عقل میزنم، ایں کار کے کنم
ای مگس عرصۂ سیمرغ نہ جولانگہ تست | عرض خود می بری و زحمتِ[1] ما می داری
ابرو
دردمندانِ بلا زہر ہلاہل نوشند | قتل ایں قوم خطا باشد، ہاں تا[2] نہ کنی

اکثر محاورے ایسے ہیں جو صرف بول چال اور بے تکلفی میں استعمال ہوتے ہیں، اہلِ قلم یہ سمجھ کر کہ وہ متانت کے خلاف ہیں، تصنیفات میں استعمال نہیں کرتے۔ مثلاً اردو میں یہ محاورات "جاو بھی، رہنے بھی دیجئے، دیکھ لیا"، وغیرہ وغیرہ روزمرہ استعمال میں آتے ہیں، لیکن ناسخ خواجہ درد، سودا وغیرہ ان کو نظم متانت کے خلاف سمجھتے ہیں، لیکن اس سے زبان کی وسعت گھٹتی ہے، اس لئے جن شعرار کو زبان کا خیال زیادہ ہے، مثلاً داغ وغیرہ ڈھونڈ ڈھونڈھ کر یہ تمام محاورات لاتے ہیں، فارسی میں روزمرہ اور محاورہ کو خواجہ صاحب نے وسعت دی، ان کے کلام میں ایسے بہت سے محاورات ملیں گے جو کسی اور کے کلام میں نہیں مل سکتے، یہاں تک کہ بول چال کے لحاظ سے وہ محاورات بھی خواجہ صاحب نے لئے ہیں جو خاص لہجہ کے محتاج ہیں اور بغیر اس لہجہ کے سمجھ میں نہیں آسکتے، مثلاً

ناصحم گفت کہ جز غم چہ ہنر دارد عشق | گفتم اے خواجۂ غافل! ہنرے بہتر ازیں

"ہنرے بہتر ازیں" کو ایک خاص لہجہ سے پڑھنا چاہئے، جس سے استفہام کے معنی پیدا ہوں، یعنی کیا اس سے بڑھکر کوئی اور ہنر ہوگا، یا مثلاً یہ شعر ع

کنار و بوسہ و وصلش چگویم چوں نخواہد شد

---

[1] زحمت کسے بر داشتن، کسی کو ستانا [2] ہاں تانہ کنی، دیکھو ایسا نہ کرنا،

یعنی جب یہ ہونا نہیں ہے تو اس کا ذکر کیا کریں، اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں،

خوش نوائی صاحب ذوق صاف محسوس کرتا ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام میں ایک خاص قسم کی خوش گواری پائی جاتی ہے، شاعری میں موسیقی بھی شامل ہے، اس لئے جو شعر موسیقی اور خوش نوائی سے الگ ہوگا، شاعری کے رتبہ سے گھٹا ہوگا، خواجہ صاحب کے کلام میں یہ وصف مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اکثر وہ غزلوں کی بحریں ایسی رکھتے ہیں جو موسیقی سے مناسبت رکھتی ہیں، شعروں کے ارکان اور ان کے ٹکڑے ایسے لاتے ہیں جو تال اور سم کا کام دیتے ہیں، اس غرض کے لئے اکثر ہموزن الفاظ کا پے درپے آنا مدد دیتا ہے اور گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بار بار تان آکر ٹوٹتی ہے، مثلاً

چو در دست ست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش | کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم
یکے از کفر می لافد دگر طامات می بافد | بیا کیں داوری ہا را بہ پیش داور اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد | من و ساقی بہم سازیم بنیادش بر اندازیم
شراب ارغوانی را گلاب اندر قدح ریزم | نسیم عطر گرداں را شکر در مجمر اندازیم
ہر دو روانِ من چرا میل چمن نمی کند | ہمدم گل نمی شود، یاد وطن نمی کند
دردم از یارست و درماں نیز ہم | دل فدائے او شد و جاں نیز ہم
گر ز دست زلف مشکینت خطائی رفت رفت | ور ز ہندوی شما بر من جفائے رفت رفت

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے، قدما کے کلام میں صنائع لفظی یعنی صنعت اشتقاق، ترصیع، ایہام نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، مراعات النظیر (تناسب لفظی) جو حد سے گذر کر ضلع جگت بن جاتی ہے، سلمان ساوجی نے رواج دیا اور کچھ زمانہ تک بڑے زور و شور سے جاری رہی، ان صنعتوں کو عموماً شعرا نے محض صنعت

کی حیثیت سے استعمال کیا، یعنی اس لحاظ سے کہ اس کا التزام وقت آفرینی ہے اور وقت آفرینی ایک کمال کی بات ہے، اس عام رو سے خواجہ صاحب بھی نہ بچ سکے، چنانچہ مراعات النظیر اور ایہام وطباق ان کے ہاں بھی جا بجا پائے جاتے ہیں، مثلاً

تا دل ہرزہ گرد من رفت بہ چین زلفِ او　　زاں سفرِ دراز خود قصد وطن نمی کند

سخنانماند سخن طے کنم شراب کجاست　　بدہ بہ شادی روح روانِ حاتم طے

ع نانِ حلال شیخ ز آب حرام ما

لیکن خواجہ صاحب نے زیادہ تر اُن لفظی صنعتوں کو لیا ہے جن سے خوش آہنگی اور خوش نوائی پیدا ہوتی ہے، مثلاً

ایں کہ می گویند آں بہتر ز حسن　　یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

اس شعر میں این و آں کا جو مقابلہ ہے اس کو ایک سطحی النظر یہ خیال کریگا کہ مراعات النظیر یا صنعتِ اضداد ہے، لیکن ایک صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ ان دو لفظوں کی آواز کا تناسب ایسا ہے جو خود بخود کانوں کو خوش معلوم ہوتا ہے اور موسیقی کی حیثیت سے دیکھیں تو گویا گیت کے اجزا ہیں، مثلاً

قاصد حضرت سلمے کہ سلامت بادا　　چہ شود گر بہ سلامے دلِ ما شاد کند

اس میں سلمی سلامت اور سلام جو ملتے جلتے الفاظ آئے ہیں ان سے عام آدمی کو صنعت اشتقاق کا خیال پیدا ہوگا، لیکن اصل میں یہ متناسب الفاظ ذرا ذرا سے فاصلہ پر بار بار آکر کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتے ہیں، یا مثلاً

اے صبا گر بہ جوانانِ چمن باز رسی　　خدمت از ما برساں سرو و گل و ریحاں را

اس شعر میں سرو و گل و ریحاں جو الفاظ آئے ہیں، عام لوگ اس کا نام مراعات النظیر

یا صنعت اعداد وغیرہ رکھیں گے لیکن اس شعر کی بحر اور اس میں خاص ان تناسب الوزن الفاظ کا اخیر میں آنا ایک خوش نوائی پیدا کرتا ہے، جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھی. حالانکہ یہ ممکن تھا کہ وہ صنعتیں باقی رہتیں؛

خواجہ صاحب کے کلام میں جہاں اس قسم کی صنعتیں نظر آئیں غور سے دیکھو تو ان میں دراصل خوش نوائی اور خوش آہنگی کا وصف ملحوظ ہوتا ہے، ملاحظہ ہو،

اعتمادے نیست بر دور جہاں	بلکہ بر گردونِ گرداں نیز ہم
از بہر بوسۂ زلبش جاں ہمی دہم	اینم نمی ستاند و آنم نمی دہد
شیوۂ ناز تو شیریں خط و خال تو ملیح	چشم و ابروی تو زیبا قد و بالای تو خوش
بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت	کنار آب رکنا باد و گلگشتِ مصلا را
گر ز دست زلفِ مشکینت خطائی رفت رفت	ور ز ہندوی شما بر من جفائی رفت رفت
برقِ عشق ار خرمن پشمینہ پوشے سوخت سوخت	جور شاہ کامراں گر بر گدائے رفت رفت
گر دلم از غمزۂ دلدار تابے برد برد	در میان جان و جانان ماجرائے رفت رفت

غور کرو ان اشعار میں جہاں مکرر الفاظ آئے ہیں کس قدر کانوں کو خوش معلوم ہوتے ہیں، ظاہر بیں اس کو صنعتِ تکرار کہہ دیگا، لیکن کیا ہر جگہ کسی لفظ کا مکرر آنا کوئی لطف پیدا کرتا ہے،

کاروان رفت و تو در خواب و بیاباں در پیش	کے روی؟ رہ ز کہ پرسی؟ چہ کنی؟ چوں باشی؟

مصرع اخیر میں تم کو خیال ہوگا کہ اس کی خوبی صرف یہ ہے کہ پے درپے سوالات آئے ہیں، جس سے صنعتِ استفہام پیدا ہوگئی ہے، لیکن اس سے قطع نظر کرکے دیکھو یہ الفاظ کس طرح کانوں کو ایک خاص تناسب کھٹکا دیتے ہیں، اور خوش آیند معلوم ہوتے ہیں؛

خدارا رحمی اے منعم کہ درویشِ سرکویت | درے دیگر نمی داند رہ دیگر نمی گیرد

بندش کی چستی | بندش کی چستی ایک وجدانی چیز ہے، اس کی تعریف اور تحدید نہیں ہو سکتی لیکن مذاق صحیح آسانی سے اس کا احساس کرتا ہے، مثلاً ان اشعار میں باوجود اتحاد مضمون اور الفاظ کے، بندش کی چستی کا جو فرق ہے ہر شخص محسوس کر سکتا ہے،

سلیم مشاطہ اجمالِ تو دیوانہ می کند | آئینہ را خیال پری خانہ می کند

صائب دل را نگاہ گرمِ تو دیوانہ می کند | آئینہ را رخِ تو پری خانہ می کند

غنی ہر کس کہ دید روی تو دیوانہ می شود | آئینہ از رخِ تو پری خانہ می شود

صائب سرچشمۂ حیات لب می چکان اوست | عمر دوبارہ سایۂ سرو روان اوست

نظرت عیش ابد بہ کام دل دردمند تست | عمر دوبارہ سایۂ سرو بلند تست

صائب ہمیشہ صاحب طول امل غمیں باشد | کہ چین بقدر بلندی در آستیں باشد

بیدل دستگاہ ہست ہر قدر بیش است کلفت بیشتر | در خور طول است چین جائے کہ دارد آستیں

خواجہ صاحب جیسا کہ خود انھوں نے متعدد موقعوں پر تصریح کی ہے، سلمان اور خواجو کی غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں، ان غزلوں کے مقابلہ کرنے سے بندش کے زور اور چستی کا فرق صاف نظر آجاتا ہے،

سلمان	حافظ
ہمچناں مہر تو ام مونسِ جان است کہ بود	گوہر مخزنِ اسرار ہمان است کہ بود
ہمچناں ذکر تو ام در دو زبان است کہ بود	حقۂ مہر بداں مہر و نشان است کہ بود

"مونس جان" کے قافیہ کے جواب میں خواجہ صاحب کا شعر ہے،

از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دمِ صبح | بوی زلفِ تو ہمان مونسِ جان است کہ بود

حافظ	سلمان
عاشقاں بندۂ ارباب امانت باشند	شوقم افزوں شد و آرام کم و صبر نماند
لاجرم چشم گہر بار ہماں است کہ بود	در فراقِ تو و لے عہد ہماں ست کہ بود

اس شعر میں سلمان کی بندش کی سستی صاف ظاہر ہے "در فراق تو" کا موقع پہلے مصرع کے ابتدا میں ہے، وہاں سے الگ ہو کر و لے کے ساتھ اس کی ترکیب بالکل بے مزہ ہو گئی ہے،

حافظ	سلمان
طالب لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید	کے بود کے کہ بگویند سرا سر اغیار
ہمچناں در عمل معدنِ کان است کہ بود	کہ فلاں یار ہماں یار فلان است کہ بود
عکس روی تو چہ در آئینۂ جام افتاد	وراز ل عکسِ مئی لعل تو در جام افتاد
عارف از پرتو می در طمع خام افتاد	عاشقِ سوختہ دل در طمع خام افتاد

جام کے قافیہ میں حافظ کے اور اشعار ملاحظہ ہوں،

آں شدای خواجہ کہ در صومعہ بازم بینی — کار من بارخِ ساقی ولبِ جام افتاد

حافظ	سلمان
صوفیاں جملہ حریف اند و نظر باز و لے	عشق بر کشتنِ عشاق تفادل می کرد
زاں میاں حافظ سودا زدہ بدنام افتاد	اولیں قرعہ کہ زد بر من بدنام افتاد
در خمِ زلف تو آویخت دل از چاہ زنخ	خالِ مشکین تو در عارض گندم گوں دید
آہ کز چاہ بروں آمد و در دام افتاد	آدم آمد زپے دانۂ در دام افتاد

ان اخیر کے دونوں شعروں کے مقابلہ سے بندش کی چستی کا مفہوم تم کو علانیہ

واضح ہو جائیگا سلمان کا شعر اگرچہ معنی کے لحاظ سے بالکل ناموزوں ہے، چہرہ کو دام سے کوئی مناسبت نہیں، بخلاف اس کے خواجہ صاحب نے ذقن کو چاہ اور زلف کو دام کہا ہے، اور یہ عام مسلمہ تشبیہ ہے، لیکن سلمان کے شعر میں بندش کی جو چستی ہے، خواجہ صاحب کے شعر میں نہیں ہے ع آدم آمد زپے دانہ و در دام افتاد،، آدم، دانہ، دام، یہ الفاظ ایسی ترتیب اور خوبصورتی اور روانی سے جمع ہو گئے ہیں کہ مصرع میں نہایت برجستگی پیدا ہو گئی ہے، خواجہ صاحب کا مصرع پھس پھسا ہے، اور خصوصاً آہ کے لفظ نے مصرع کو بالکل کم وزن کر دیا ہے،

حافظ	سلمان
آں کہ از سنبل او غالیہ تابے دارد	دام زلف تو بہر حلقہ طنابے دارد
باز با دل شدگان ناز و عتابے دارد	چشم مست تو بہر گوشہ خرابے دارد
چشم من کرد بہر گوشہ رواں سیل سرشک	خون چشم من ازاں ریخت کہ تا ظن نہ برم
تا سہی سرو ترا تازہ بہ آبے دارد	کہ برش مردم صاحب نظر آبے دارد
ماہ خورشید نمایش ز پس پردۂ زلف	رسن زلف تو سر رشتۂ جان من و شمع
آفتابے ست کہ در پیش سحابے دارد	ہر یک از آتش رخسار تو تابے دارد
شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد	آں کہ ز ابرو و مژہ تیر و کمانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد	چشم ہا کرد سیہ قصد جہانے دارد

ان مقابلوں سے بندش کی چستی اور زور کا مفہوم اچھی طرح تمھاری سمجھ میں آگیا ہوگا، اب خواجہ صاحب کے اشعار ذیل کو اس نظر سے دیکھو،

آں شمع سر گرفتہ دگر چہرہ بر فروخت   واں پیر سالخوردہ جوانی ز سر گرفت

آں عشوہ داد عشق کہ مفتی زرہ برفت | واں لطف کرد دوست کہ دشمن حذر گرفت
زنہار زاں عبارت شیرین و دل فریب | گوئی کہ پستۂ تو سخن در شکر گرفت
من ایستادہ تا کنمش جاں فدا چو شمع | او خود گذر بمن چوں نسیم سحر نہ کرد
ماہی و مرغ دوش نہ خفت از فغان من | واں شوخ دیدہ بیں کہ سر از خواب بر نکرد
بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من | کوتاہ کرد قصۂ زہد دراز من
دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست | وندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم | گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد
زلفیں سیہ خم بہ خم اندر زدۂ باز | بخت من شوریدہ بہم بر زدۂ باز
بر شیشہ صبرم زدۂ سنگ و لیکن | با تو چہ تواں گفت کہ ساغر زدۂ باز

ہمارے نزدیک حسن کلام کا بڑا جوہر یہی حسن بندش ہے،

جاحظ کا قول ہے کہ مضمون بازاریوں تک کو سوجھتے ہیں، جو کچھ فرق اور امتیاز ہے لطف ادا اور بندش کا ہے، سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک مضمون کسی شاعر نے باندھا بعینہٖ وہی مضمون دوسرے نے باندھا، الفاظ تک اکثر مشترک ہیں، لیکن لفظوں کے الٹ پھیر اور ترتیب سے وہی مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا،

شوخی و ظرافت | خواجہ صاحب کے کلام میں جا بجا شوخی اور ظرافت بھی ہے لیکن نہایت لطیف اور نازک ہے، شیخ سعدی اور خیام بھی ظرافت کرتے ہیں، لیکن زیادہ کھل جاتے ہیں، خواجہ صاحب کی شوخی طبع کی لطافت دیکھو،

واعظ شہر کہ مردم ملکش می خوانند | قول ما نیز ہمین است کہ او آدم نیست

یعنی واعظ کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں، اس قدر تو ہمکو بھی تسلیم ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے،

(باقی فرشتہ ہے! یا شیطان اس کا فیصلہ ہوتا رہے گا)

زہی سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد به کوی می فروشانش به جامے در نمی گیرند

مجلسِ وعظ دراز ست و زماں خواہد شد گر زمسجد به خرابات شدم عیب مگیر

یعنی میں اگر مسجد سے اٹھ کر شراب خانہ میں چلا گیا، تو اعتراض کی کیا بات ہے، وعظ تو ابھی تک ہوتا رہے گا، میں پی کے چلا آؤں گا،

اسی مضمون کو قائم نے اردو میں ادا کیا ہے،

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

حافظ

محتسب خم شکست و بندہ سرش سن بالسن والجروح قصاص

قرآن مجید میں قصاص کی آیت میں مذکور ہے کہ زخم کا بدلا زخم ہے، مثلاً اگر کوئی کسی کا دانت توڑ ڈالے تو اس کا بھی دانت توڑ ڈالا جائیگا،

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ محتسب نے خمِ شراب کو توڑ ڈالا تھا، میں نے قصاص کے حکم کے موافق اس کا سر توڑ دیا،

ناخلف باشم اگر من به جوی نفروشم پدرم روضۂ رضواں بدو گندم به فروخت

میرے باپ (حضرت آدمؑ) نے بہشت کو گیہوں کے بدلہ میں بیچ ڈالا تھا، میں اگر ایک جو کے بدلہ میں نہ بیچوں تو ناخلف ہوں،

غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد من وانکار شراب! ایں چہ حکایت باشد

میں اور شراب کا انکار! غالباً مجھے تو اتنی ہی عقل کافی ہے (یعنی یہ سمجھ لوں کہ شراب چھوڑنا مجھکو زیبا نہیں، اس سے زیادہ عاقل اور دوراندیش ہونا مجھکو ضرور نہیں،

نہ من ز بے عملی در جہاں ملولم و بس ملامت علما ہم ز علم بے عمل است

میں بیکاری سے (یعنی شراب وغیرہ کا مشغلہ نہیں ہے) دل گرفتہ ہوں، بے عمل ہونا برا ہے اسی لئے عالم بے عمل بھی اچھا نہیں ہوتا،

نقد دلے کہ بود مرا صرف بادہ شد قلب سیاہ بود بہ جائے حرام رفت

قلب دل کو بھی کہتے ہیں اور کھوٹے سکہ کو بھی، اس بنا پر کہتے ہیں کہ میرا قلب اگر شراب میں صرف ہوا تو ہونا ہی چاہیئے، ع مال حرام بود بجائے حرام رفت،

تسلسل مضامین ایشیائی غزل گوئی کا ایک بڑا عیب یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ کسی خیال کو مسلسل نہیں ظاہر کر سکتے، ہر غزل متعدد اور مختلف بلکہ متناقض مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے، غزل کے جو مہمات مضامین ہیں، مثلاً حسن، عشق، سراپائے معشوق، وصل، ہجر، ہزاروں دفعہ بندھے ہیں، لیکن ان میں سے کسی مضمون کی منسبت کوئی مسلسل اور تفصیلی بیان کہیں نہیں مل سکتا، اگرچہ حقیقت میں یہ چنداں اعتراض کی بات نہیں، مسلسل خیالات کے لئے مثنوی کی صنف متعین کر دی گئی ہے، قصائد اور قطعات سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے، غزل اس ضرورت کے لئے خاص کر دی گئی ہے، کہ چھوٹے چھوٹے مفرد خیالات جو شاعر کے دل میں آتے رہتے ہیں، ضائع نہ جانے پائیں، اس صنف کے لئے نہایت قادر الکلامی درکار ہے، یورپ کو اپنی شاعری پر ناز ہے لیکن وہ کسی خیال کو دو چار شعروں سے کم میں نہیں ادا کر سکتے، بخلاف اس کے ہمارے شعرا نہ صرف چھوٹی چھوٹی باتیں بلکہ نہایت وسیع اور بڑے مضامین کو بھی ایک شعر میں ادا کر دیتے ہیں، جو اختصار کی وجہ سے فوراً زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں، جو نہ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے مثنوی یا قصائد کی وسعت درکار ہو، نہ اتنے مختصر کہ ایک دو شعروں

میں سما جائیں، اس لئے اس قسم کے مضامین کے لئے غزلیں ہی مناسب ہیں، اس صورت میں ضرور ہے کہ غزل مسلسل ہو یعنی پوری غزل یا غزل کے متعدد اشعار ایک ہی مضمون کے لئے خاص کر دیئے جائیں۔ اس قسم کی غزل کا رواج اگرچہ عام نہیں ہوا تاہم جستہ جستہ پائی جاتی ہیں اور سب سے پہلے خواجہ صاحب نے اس کو ترقی دی، ان کی اکثر غزلوں میں ایک خاص خیال یا ایک خاص سماں دکھایا گیا ہے، اس قسم کی چند غزلوں کے مطلع ہم نقل کرتے ہیں،

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند — وندران ظلمتِ شب آب حیاتم دادند

بود آیا کہ در میکدہ ہا بکشایند — گرہ از کار فروبستۂ ما بکشایند

بامداداں کہ بہ خلوت گہ کاخ ابداع — شمع خاور فگند بر ہمہ اطراف شعاع

ای پیک پی خجستہ چہ نامی فدیت لک — ہرگز سیاہ چردہ ندیدم بہ این نمک

گر ز دستِ زلفِ مشکینت خطائی رفت رفت — ور ز ہندوی شما بر من جفائی رفت رفت

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بہ وجود — بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بہ سجود

(بہار کے ذکر میں ہے)

یاد باد آں کہ نہانت نظرے با ما بود — رقم مہر تو بر چہرۂ ما پیدا بود

پوری غزل میں پہلی دلچسپیوں کو یاد دلایا ہے، اور ہر شعر یاد باد سے شروع ہوتا ہے،

خوشا شیراز و وضع بے مثالش — خداوندا نگہدار از زوالش

(شیراز کی تعریف میں ہے)

نسیم صبح سعادت بداں نشاں کہ تو دانی — خبر بہ کوئی فلاں بر بداں زماں کہ تو دانی

(قاصد سے پیغام کہا ہے)

ابن یمین فرلویدی

باپ کا نام محمود ہے، قوم کے ترک تھے، اور ترکستان وطن تھا، سلطان محمد خدابندہ کے زمانہ میں خراسان میں آئے اور فرلوید میں جو ایک قصبہ کا نام ہے قیام اختیار کیا، یہاں زمین اور جائدادیں خریدیں، یہ الجایتو سلطان کا عہد حکومت تھا، اور علاء الدین محمد وزیر سلطنت تھے، علاء الدین نے ان کی نہایت قدر دانی کی، شعر کہتے تھے، یہ رباعی ان کے انداز کلام کا نمونہ ہے،

دارم زعتاب فلکِ بوقلموں   وزگردش روزگار خس پرورِ دوں
چشمے چو کنارۂ صراحی ہمہ اشک   جانے چو میانۂ پیالہ ہمہ خوں

ابن یمین فرلوید میں پیدا ہوئے، باپ نے شاعری کی تعلیم دی، اکثر جن طرحوں پر خود کہتے تھے، بیٹے سے بھی کہلاتے تھے، چنانچہ اوپر کی رباعی پر ان کی رباعی بھی ہے،

دارم زجفای فلک آئینہ گوں   پر آہ دلے کہ سنگ ازو گردد خوں
روزے بہ ہزار غم بہ شب ورآرم   تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیروں

ابتدا میں سرداروں کی مداحی کرتے تھے،

بالآخر فقر و قناعت اختیار کی، اور شاہی تعلقات سے کنارہ کش ہو گئے، تھوڑی سی زمین قبضہ میں تھی، اس کی کاشتکاری سے زندگی بسر کرتے تھے، ۸ رجمادی الثانی ۷۶۹ھ میں وفات پائی، مرتے وقت یہ رباعی لکھی تھی،

منگر کہ دل ابن یمین پر خوں شد | بنگر کہ ازیں سرای فانی چوں شد
مصحف بہ کف و چشم بہ رہ روی بہ دوست | با پیک اجل عزرہ زناں بیروں شد

کلام | ان کا دیوان سربداروں کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا، غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں، کہ میں نے ان کا دیوان دال کی ردیف تک دیکھا ہے، لیکن یہ غالباً قطعات کا دیوان ہوگا، تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہ غزل اور قصائد سب کچھ کہتے تھے، ید بیضا میں انکی غزل کے بعض اشعار نقل کئے ہیں،

سر بدہ اے دیدہ ہر دم اشک غمازِ مرا | تا نسازد فاش پیش مرد ماں رازِ مرا
زخود بیگانہ بودن در رہ عشق | بہ آں معشوق طرح آشنائی است
عشق تا در دل آید نہ در آید نہ نمود | بادہ پر شور نشد تا کہ بہ مستاں نہ رسد[1]

ان اشعار سے اگرچہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ غزل میں کم مایہ نہیں، لیکن ان کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں بھی قناعت اور خود داری ان کا خاص حصہ ہے، ان مضامین کو ان سے بہتر آج تک کوئی ادا نہ کرسکا، اور چونکہ ان کا قال، حال کی تصویر ہے، اس لئے ایک خاص اثر رکھتا ہے جو ہر شخص کے کلام میں پیدا نہیں ہوسکتا،

دو قرص ناں، اگر از گندم است یا از جو | دو تا ی جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بہ چار گوشۂ دیوار خود بہ خاطر جمع | کہ کس نگوید از یں جا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمین | ز فر مملکت کے قباد و کے خسرو

اگر دو گاؤ بدست آوری و مزرعۂ | یکے امیر و یکے را وزیر نام کنی

---

[1] یہ تمام حالات ید بیضا سے اور تذکرۂ دولت شاہ سے لئے گئے ہیں،

بداں قدر کہ چو کفاف معاش تو نہ شود
بروی و نان جوے از یہود، وام کنی
ہزار بار ازاں بہ کہ از پے خدمت
کمر بہ بندی و بر مردکے سلام کنی

ز دیوانہ کرد روزے سوال
سلیمان مرسل علیہ السّلام
کہ چوں بینی ایں سلطنت کز ید
مرا ماند با ایں ہمہ احتشام
چہ خوش گفت دیوانہ اورا جواب
کہ چوں نیست ایں مملکت مستدام
پدر مدتے آہن سرد کوفت
تو در باد پیمودنے صبح و شام

حضرت داؤدؑ زرہ بنایا کرتے تھے، اور حضرت سلیمانؑ کی نسبت مشہور ہے کہ اُن کا تخت ہوا پر چلتا تھا، فارسی میں آہن سرد کوفتن، اور باد پیمودن کے معنی بیکار کام کرنے کے ہیں، دیوانہ نے حضرت داؤدؑ کے زرہ بنانے اور حضرت سلیمانؑ کے تخت ہوا پر چلنے کو آہن سرد کوفتن اور باد پیمودن سے تعبیر کیا ہے،

مرد آزادہ در میان گروہ
گرچہ خوش گوی و عاقل و داناست
محترم آنگہے تواند بود
کہ از ایشاں بہ مالش استغناست
واں کہ محتاجِ خلق شد خوار است
گرچہ در علم بو علی سینا است

شنیدہ ام کہ یکے عقربے ز خانۂ خویش
بروں دوید و ہمی زد ہر آنچہ آمد پیش
بہ پیشش آمد سنگے عظیم و بس منکر
بزد بہ سنگ دو صد نیش تا بگردد ریش
ز سنگ نعرہ بر آمد کہ خویش رنجہ مدار
کہ ضرب نیش تو ما را نہ کم کند نہ بیش

جواب داد ش وگفتش کہ راست می گوئی — ولے پدید کند ہر کہ ہست جوہر خویش

شاعری نیست پیشۂ کہ ازاں — رسدت نان و نیز ترہ بہ دوغ
راستی، سخت زشت و بے معنی است — اجرتے خواستن برائے دروغ
زاں بود کار شاعران بے نور — کہ ندارد چراغ کذب فروغ

قناعت اور توکل کے ساتھ، یہ نکتہ بھی ابن یمین کے ذہن نشین ہے کہ زر کے بغیر اطمینان نہیں حاصل ہوتا، چنانچہ فرماتے ہیں،

لالہ را گفتم اے پری پیکر — سیرتت خوب و صورتت نیکوست
راست گو ایں سیہ دلی از چیست — مگرت زحمتے رسید از دوست
گفت زیرا کہ من ندارم زر — زر کہ اسباب شادکامی ازوست
غنچہ را بیں کہ خردۂ دارد — مے نہ گنجد ز خرمی در پوست

کبھی کبھی فلسفہ کہہ جاتے ہیں،

زدم از کتم عدم خیمہ بہ صحرائے وجود — از جمادے بہ نباتے سفرے کردم و رفت
بعد ازاں کشش نفس، بہ حیوانی بُرد — چوں رسیدم بوی ازوی گذرے کردم و رفت
بعد ازاں در صدف سینۂ انسان بہ صفا — قطرۂ ہستی خود را گہرے کردم و رفت
با ملائک پس ازاں صومعۂ قدسی را — گرد بر گشتم و نیکو نظرے کردم و رفت
بعد ازاں سوی او بردم و چوں ابن یمین — ہمہ او گشتم و ترک دگرے کردم و رفت

حیاتِ شبلی

(حصۂ اول)

مرتبۂ مولانا سید سلیمان، ندوی

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری نہین ہے، بلکہ اس مین اُن کی وفات سنہ ۱۹۱۴ء تک اس کے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانون کی مذہبی سیاسی علمی، تعلیمی، ادبی، اصلاحی اور دوسری تحریکون اور سرگرمیون کی مفصل تاریخ آگئی ہے، کتاب کے شروع مین جدید علم کلام کی نوعیت، اس کی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی اور تغلق کے زمانہ سے لیکر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانون کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہین ضمناً ان تعلیمی ادارون کی جن سے مولانا کا تعلق رہا ہے مجمل تاریخ بھی آگئی ہے، اس کی ضخامت مع مقدمہ اور دیباچہ وغیرہ کے ۹۲۰ صفحے ہین، جس مین دار المصنفین، ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اور شبلی انٹر کالج کی عمارتون کے [illegible] ہاف ٹون بلاک فوٹو بھی شامل ہین، کاغذ اور طباعت اعلیٰ، قیمت غیر مجلد علاوہ محصول ڈاک صرف آٹھ روپیہ، مجلد لعہ یہ کتاب کا حصۂ اول ہے، دوسرا حصہ جس مین مولانا کی شاعری اور تصنیفات وغیرہ پر ریویو و تبصرہ ہوگا، زیر تالیف ہے،

مسعود علی ندوی
منیجر دار المصنفین
شہر اعظم گڈھ

(مطبع معارف مین صدیق احمد نے چھپوا کر شائع کیا)